تہذیبی سلسلہ

صفیہ بیگم

یعنی

بچپن کی منگنی کا عبرت ناک قصہ

جسے

محترمہ محمدی بیگم صاحبہ مرحومہ نے

والدین کی عبرت کے لئے تصنیف کیا

اور

دار الاشاعت پنجاب نے

سنہ ۱۹۱۸ء

باہتمام شیخ گلزار محمد پرنٹر

گلزار محمدی سٹیم پریس لاہور میں چھپوا

باب اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اوّل

صفیہ اپنی ماں باپ کی اکلوتی اور لاڈلی بچی تھی۔ باپ نے اُسے بڑے چاؤ سے تعلیم دی تھی۔ ماں بچاری پُرانے وقتوں کی بیبیوں کی طرح سیدھی سادی عورت تھی۔ پڑھنے لکھنے میں کچھ برائے نام ہی شُدبُد تھی۔ البتہ دستکاری میں اپنا نظیر نہ رکھتی تھی۔ اُس نے اپنی بیٹی کو چھوٹی سی عمر میں تمام ہُنر سکھلا کر ایک سلیقہ شعار سُگھڑ بیٹی بنا دیا تھا۔

جس محلّے میں صفیہ کا گھر تھا۔ وہ محلّہ نواب صاحب کے نام سے مشہور تھا۔ یہ نواب صاحب بڑے بھاری رئیس اور جاگیردار تھے۔ اور سرکار میں اُنہیں بہت اعزاز حاصل تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ کہ اُنہیں نواب صاحب کے ہاں کی مُغلانی صفیہ کی ماں کا بلاوا لے کر آئی۔ اور کہا کہ بیگم آپ کو نواب بیگم صاحبہ یاد فرماتی ہیں۔ صفیہ کی ماں بولی۔ کہ بڑی بی مَیں تو شوق سے

جوان بیٹی کا ساتھ ہے۔ نہ اسے گھر پر چھوڑتے بن پڑتا ہے۔ نہ ساتھ لے جاتے +

مُغلانی۔ اچھی بیگم بچّی کو ساتھ ہی لئے چلو۔ ڈر ہی کیا ہے + وہ بھی تو اپنا ہی گھر ہے۔ ایسا ہی ہے تو صفیہ کو چھوٹی بیگم (نواب صاحب کی بیٹی) کے پاس بٹھا دینا +

بیگم۔ نہ بیوی۔ اِن کے ابا جان اِن کو کہیں بھیجنے کے روادار نہیں پھر بھلا میں آپ سے آپ کہاں لے کر جاؤں + دوسرے اب اس کو ساتھ لے کر جانا مناسب نہیں + اللہ جانتا ہے۔ جب سے بچّی نے ہوش سنبھالا ہے۔ مجھے تو رات دن اس کا ہی فکر رہتا ہے۔ نہ میں کہیں آنے جانے کی رہی۔ نہ کسی سے ملنے ملانے کی +

مُغلانی۔ چھوٹی بیگم کی کہیں منگنی بھی کی یا نہیں ؟

بیگم۔ اس کی منگنی تو اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی ہو گئی تھی +

مُغلانی۔ وُہ کہاں ؟

صفیہ کی ماں۔ اس کے بڑے ابا کے بیٹے سے + جب میری صفیہ پیٹ میں تھی۔ تو اُس کی بڑی امّاں نے کہا تھا۔ کہ بھابی اگر اب کے تمہارے لڑکی ہُوئی تو میں لُوں گی + جب خیر سے یہ پیدا ہُوئیں۔ تو اُنہوں نے ٹھیکرے میں روپیہ ڈال دیا۔ اور کہا لو بھابی صفیہ تو ہماری ہو چکی + میں نے کہا۔ کہ اللہ اسے تمہارا ہی کر کے جلائے۔ تم کیا بیگانی ہو + اب ان ہیں۔ اور لڑکا بھی جوان۔ پر کیا کہوں ؟

کی اُتاری ہُوئی نہیں۔ یہ تصویر مس صاحبہ نے اُتاری ہے ؂

مُغلانی۔ بیٹی وہ مس صاحبہ کون ہیں ؟

صفیہ۔ وہ ہسپتال کی لیڈی ڈاکٹر ہیں۔ ان سے ہی مَیں نے تصویر بنانی سیکھی ہے۔ دیکھو یہ اُن کی تصویر ہے۔ یہ مَیں نے بنائی ہے ؂

مُغلانی۔ بیٹی ایڑی دیکھ کر کہتی ہوں۔ صد رحمت ہے۔ تمہاری عقل پر۔ اللہ تمہیں جیتا رکھے۔ تُم نے اِتّی سی عُمر میں کیا کچھ سیکھا ہے۔ مَیں نے سُنا ہے بیٹی تمہیں ڈاکٹری بھی آتی ہے۔ واری دیکھو توکئی دن سے میرا کان بہتا ہے۔ اس میں کیا ہُوا ہے ؂

صفیہ۔ (کان دیکھ کر) بڑی بی اس کے اندر تو کچھ ورم معلوم ہوتا ہے۔ شاید کوئی پھُنسی ہوگی۔ سو تم دونو وقت صبح شام میرے پاس آ
مَیں پچکاری سے کان صاف کر کے اس میں دوا ڈال دیا کروں د
ہی روز میں آرام ہو جائے گا ؂

مُغلانی۔ بھلا بیٹی بھلا۔ اللہ تمہاری عُمر میں برکت دے۔ مَیں روز آ جایا کروں گی۔ چار قدم پر تو گھر ہی ہے۔ آنا کون مشکل ہے۔ اب تو مَیں جاتی ہُوں۔ مجھے آئے کو بہت ہی دیر ہو گئی ہے۔ بیگم انتظار کر رہی ہونگی۔ میرا جی تو اب بھی گھر جانے کو نہیں چاہتا۔ اللہ جانتا ہے۔ چھوٹی بیگم میرا جی یہی چاہتا ہے۔ کہ بس تمہارے پاس ہی بیٹھی رہوں۔ لو اللہ بیلا اب مَیں جاتی ہُوں۔ اے ہاں مجھے ذرا اپنا کمرہ تو دکھا دیجیو کئی دفعہ ارادہ کیا۔ کہ تمہارے بیٹھنے کی جگہ دیکھونگی۔

بناناگناہ ہے ٭

مُغلانی۔ اَچھی بیگم ایک تصویر تو چھوٹی بیگم کی بنی ہُوئی مجھے بھی دکھاؤ ٭

بیگم۔ صفیہ بیٹی ذرا اپنے ہاتھ کی بنی ہُوئی تصویریں تو لے آؤ ٭ نواب صاحب کے ہاں سے بی مُغلانی آئی ہُوئی ہیں۔ وہ دیکھنے کو مانگتی ہیں ٭

صفیہ تصویروں کا البم لے کر آئیں۔ جُھک کر بڑے ادب سے بی مُغلانی کو سلام کیا ٭

مُغلانی۔ بیٹی جیتی رہو۔ اللہ نیک نصیب کرے۔ سونے کے سہرے بیاہ ہو۔ ماں باپ کو خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں۔ تمہاری ماں کا کلیجہ ٹھنڈا رہے۔ بیٹی ذرا مجھے اپنے ہاتھ کی تصویریں بنی ہُوئی تو دکھا دو ٭

۔ دیکھو یہ تصویر میرے ابا جی کی ہے ٭

۔ سبحان اللہ کیسی صاف بنی ہے۔ جیسے ہُو بہُو میر صاحب ہی بیٹھے ہیں۔ قُربان جاؤں تیرے اِن ہاتھوں کے۔ کیا تصویر ڈھالی ہے؟

صفیہ۔ بڑی بی بھلا پہچانو تو یہ تصویر کس کی ہے ؟

مُغلانی۔ بیٹی یہ تو عَین مَین تمُہاری ماں کی تصویر ہے۔ دیکھو بالکُل بیگم ہی جیسا ناک نقشہ ہے ٭ کیوں بیگم صاحب کی تصویر ہے نا ؟

صفیہ۔ ہاں تم نے خوب پہچان لیا۔ یہ میری امّاں جان کی تصویر ہے ٭ اچھا بتاؤ۔ یہ کون کون بیٹھے ہیں ؟

تو تم بیٹھی ہو۔ اور یہ دُوسری ہو نہ ہو تمہاری ہمنیلی آمنہ ہے

ر آمنہ ہی ہیں۔ لیکن تصویر میرے اپنے ہاتھ

وُہ اُکتا کر اپنے باپ کے پاس بھاگ گیا۔

وُہ کہتے تھے۔ کہ بی صفدر جبین تو میری صفیہ کا شاگرد بنے گا۔ اُسے صفیہ جتنا کیا اُس کا عشر عشیر بھی علم نہیں آنے کا۔ اس بچی کا عجب حال ہے۔ بس یہی چاہتی ہے۔ کہ دُنیا جہان کا علم گھول کر پی جائے۔ چھوٹے موٹے مرضوں کی دوا علاج بھی خاصہ کر لیتی ہے۔ الماری بھر دوائیں رکھی ہیں۔ کہیں نگوڑی پچکاریاں ہیں۔ کہیں تھرمامیٹر اور دوائیں۔ ناپنے کے پیمانے اور جانے کیا کیا انگریزی اَوزار منگوا رکھے ہیں۔ مجھے تو نگوڑوں کے نام بھی نہیں آتے۔ ہسپتال کی ڈاکٹر مس ان پر فدا ہیں۔ جو بیمار آتا ہے۔ اس کا حال ان سے آکر کہتی ہیں۔ بعضے بیمار ان کو دکھلانے کو یہاں لے آتی ہیں۔ ان کے سامنے اُن کے پھوڑے پھنسی چیرتی ہیں۔ یہ بچی سب باتیں سیکھ گئی ہے۔ مجھے تو نگوڑا خون دیکھ کر ہی ہَول آنے لگتا ہے۔

ہسپتال کی مس تصویر بنانی بھی جانتی تھیں۔ اُنہوں نے اس کو بھی تصویروں کا شوق لگا دیا۔ اب دیکھو تو بیسیوں تصویریں اِس کے ہاتھ کی بنی ہُوئی ہیں۔ اپنے گھر والوں کی اور اپنی سہیلیوں کی سب کی تصویریں اُتار رکھی ہیں۔ جو چیز پسند آئے گی۔ اُس کی تصویر اُتار کر رکھ لے گی۔ بہتیرا کہتی ہوں۔ کہ صفیہ سب ہی کام کرنا۔ مگر یہ بُت پرستی مجھے نہیں بھاتی، اِن بُتوں میں جان کہاں سے ڈالو گی۔ بیوی وہ مجھ سے بحث کر اور جانے کیا کیا حدیثیں بتا کر کہتی ہے۔ کہ وہ اَور تصویر

لڑکے کے ڈھنگ کچھ اچھے نظر نہیں آتے + ماں باپ کے لاڈ پیار نے اُسے بگاڑ دیا ہے۔ پڑھنے لکھنے سے دم چُراتا ہے + میری صفیہ کو تو پڑھنے لکھنے اور گھر کے کام دھندے کا اتنا شوق ہے۔ کہ خانہ داری کا کوئی ہُنر نہیں۔ جو اس بچّی نے نہیں سیکھا + اگلے دن اس کے ابّا کہ رہے تھے۔ کہ تمہاری لڑکی تو اچھّے اچھّے منشیوں کے کان کاٹنے لگی ہے + اس کے باپ نے اِسے گھر ہی میں پڑھایا ہے ÷

مُغلانی۔ بیوی خوشامد سے نہیں کہتی۔ میں تو سچے دل سے کہتی ہُوں۔ کہ چھوٹی بیگم تو ماشاء اللہ دسوں اُنگلیاں دسوں چراغ ہیں۔ اللہ نیک نصیب کرے۔ اور کسی بھاگ وان سے پالا ڈالے۔ اپنی جوانی کے سُکھ دیکھنے نصیب کرے + بچّی تمہاری کیا ہے؟ چاند کا ٹکڑا ہے۔ اور کم سُخن کہ بتیس دانتوں میں زبان نہیں۔ میرے تو رُوئیں رُوئیں سے اس بچّی کے لئے دُعا نکلتی ہے ÷

بیگم۔ ہاں بیوی بیٹیوں کے نصیبوں ہی کا تو سارا جھینکنا ہے + اب اس لڑکے کی طرف سے جان مُٹھی میں رہتی ہے۔ دیکھئے چار پیسے کمانے لائق بھی ہوتا ہے یا نہیں + صفیہ کے ابّا نے تو بُہتیری کوشش کی۔ کہ کسی طرح کچھ لکھ پڑھ جائے۔ پر وہ پڑھنے کے نام سے کوسوں بھاگتا صُورت شکل دیکھو۔ تو میری صفیہ سے بھی نکھرتا رنگ۔ موٹی موٹی سا خُوبصُورت کہ کیا کہوں؟ لیکن گُن اچھے نہیں + چچا نے ''' با تھا + اپنے پاس رکھ کر پڑھانا شروع کیا۔ مگر

صفیہ۔ میرے بچارے کمرے میں کیا رکھا ہے۔ تم نے نواب صاحب کے عالیشان محل اور اُن کے سجے ہُوئے کمرے دیکھے ہیں۔ اُن کے آگے میرے کمرے کی حقیقت ہی کیا ہے۔ جیسے ہم غریب آدمی ویسا ہی ہمارا سادہ سُودا کمرہ۔

مُغلانی۔ اچھی بیٹی مجھے ضرور دکھاؤ۔ مَیں نے سُنا ہے۔ کہ تمہارا کمرہ انگریزی وضع کا ہے۔

صفیہ۔ اچھا آؤ۔ صفیہ یہ کہ کر بڑی بی کو اپنے کمرے میں لے گئی۔ یہ مختصر سا کمرہ اگرچہ سادا سُودا تھا پر ہر ایک چیز اپنے قرینے سے رکھی تھی۔ اور نہایت صاف تھی۔ اس کی صفائی اور ترتیب اور مختصر سی سجاوٹ دل کو نہایت بھاتی تھی۔ اس میں دو الماریاں تھیں۔ جن میں سے ایک الماری میں دواؤں کی شیشیاں اور ڈاکٹری کے کام کے چھوٹے چھوٹے اوزار وغیرہ رکھے تھے۔ دُوسری الماری میں نہایت عُمدہ عمدہ بیش قیمت کتابیں برابر لگی تھیں۔ دیواروں میں چند خوب صُورت اور نازک تختے جڑے تھے۔ جن پر گلدان اور دو ایک اَور چیزیں خُوبصورتی کی رکھی تھیں۔ اور کچھ تصویروں کا سامان۔ ایک طرف دیوار میں ایک آئینہ آویزاں۔ آئینے کے پاس نہایت خوبصورت نازک چھوٹا سا تختہ لگا رکھا تھا اسی تختہ پر بُرش کنگھی اور تیل کی شیشی رکھی تھی۔ کھُونٹیوں پر تولئے لٹکتے تھے۔ دو میزیں تھیں جن میں ایک میز پر ٹکٹ لفافوں کا خوب ولائتی صندوقچہ دو ایک کتابیں اور لکھنے پڑھنے کا

قلمدان وغیرہ رکھا تھا۔ دُوسری میز پر سلائی کی مشین اور چند خوبصورت انگریزی بیلیں جو صفیہ نے اپنے ہاتھ سے بنائی تھیں۔ ایک کونے میں ایک چھوٹی سی مسہری اور میز کے پاس دو تین نازک کُرسیاں رکھّی تھیں۔ غرض صفیہ کے کمرے میں جس قدر سامان تھا۔ وہ نہ صرف نمائشی بلکہ سب کار آمد تھا۔ اور اُسی کو اُس نے اس سلیقے اور قرینے سے لگایا تھا۔ کہ اس کا چھوٹا سا کمرہ ایک خُوشنما دُکان سی نظر آتا تھا۔ نوّاب صاحب کی مُغلانی ایک ایک چیز کو دیکھتی اور عش عش کرتی تھیں۔ وہ اس ننھّے سے کمرے کے مقابلے میں نواب صاحب کے شاندار محل کو بھُول گئیں۔ اور آنکھیں مل مل کر صفیہ کی ایک ایک چیز کو دیکھتی تھیں۔ اور آخر کو بڑی مشکل سے صفیہ کا پیچھا چھوڑ کر اپنے گھر کو سدھاریں۔

باب دوم

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کُچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

بھرکا وقت تھا۔ اور صفیہ اپنی تصویروں کے بنانے سنوارنے
...نے آن کر اُسے بُلایا۔ صفیہ فوراً اُٹھ کر باپ کی

خدمت میں حاضر ہوئی +

اصغر حسین۔ بیٹا! باہر نواب صاحب آئے بیٹھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ میری لڑکی بیمار ہے۔ خدا کے واسطے بیٹی صفیہ کو کہو۔ کہ وہ چل کر ذرا اُسے دیکھے + حکیم جی نے دوا دی تھی۔ مگر کچھ افاقہ نہیں + تمام گھر میں نہایت بیقراری پھیل رہی ہے + عورتیں ایسی وہمی ہیں۔ کہ وہ لیڈی ڈاکٹر کو بلانے نہیں دیتیں +

مَیں نے تو ہر چند اِنکار کرنا چاہا۔ لیکن پھر شرم آگئی + آخر وہ بڑے آدمی ہیں۔ اور خود چل کر یہاں آئے ہیں۔ بہت گھبرائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں + میرے خیال میں بہتر ہو۔ کہ تم اپنی والدہ سمیت اُن کے ہاں ہو آؤ +

صفیہ۔ ابّا جان مَیں آپ کے حکم سے باہر نہیں۔ لیکن مجھے تو وہاں جاتے شرم آتی ہے +

باپ۔ شرم کی کیا بات ہے؟ تمہاری امّاں جان جو ساتھ ہونگی۔ باتیں تو وہ کریں گی۔ تم حال دیکھ لینا +

صفیہ۔ اچھا ابّا جان اگر آپ کی مرضی ہے۔ تو مَیں جاتی ہوں +

والدۂ صفیہ۔ دیکھا مَیں کہتی نہ تھی۔ کہ لڑکی تو واہی تباہ اس وقت اتنے بڑے امیر کبیر آدمی اپنے پاؤں چل اگر نہ جانے دُوں۔ تو کتنا بُرا مانیں۔ اور جو جانے نیا ڈھنگ ہے۔ کہ کنواری بیٹی اور بیگانے گھر مَیں تو کہیں کی نہ رہی +

صفیہ۔ ہَیں ہَیں امّاں جان آپ ناراض کیوں ہوتی ہیں۔ اور زبردستی کیا ہے؟ تو مَیں نہیں جاتی۔ کچھ عُذر کر دو ٭

ماں۔ اب عُذر کرتے کس طرح بَن پڑتی ہے ؟

صفیہ ماں کی ناراضی دیکھ کر باپ کا مُنہ دیکھنے لگی ٭

باپ۔ بیٹا یہ تو احمق ہیں۔ جہالت کا جامہ انہوں نے ایسا پہنا ہے۔ کہ وہ مر کر بھی نہیں اُتریگا۔ تم ان کی باتوں کا کچھ دھیان نہ کرو۔ ان کو کہنے دو٭

ماں۔ بس صاحب! تُم نے تو حد کر دی۔ لڑکی کو دیدہ دلیل بنانے میں کچھ اُٹھا نہ رکھا۔ بھلا جو ان جہان بیٹی ذات دیکھو۔ اور اوپرے گھروں کا جانا! نا صاحب میں تو ہرگز نہیں جانے دُونگی۔ وہ امیر ہیں تو ہُوا کریں۔ جاؤ جا کر کہ دو۔ کہ اُس کی ماں اجازت نہیں دیتیں ٭

میاں۔ تمہاری تو عقل ماری گئی ہے۔ تم نہ موقع دیکھتی ہو۔ اور نہ کسی کی
ت کا خیال ہے۔ ایسی بے تکی بات ہانک دیتی ہو۔ کہ جس کا نہ سر ہو
نوّاب صاحب خود یہاں آئے ہیں۔ اور پھر منّتیں خوشامدیں کر
مو یہ کیا انسانیّت ہے کہ وہ تو منّتیں کریں۔ اور مَیں ایک
با آدمی اینٹھے جاؤں ؟

ہ۔ تو اپنے گھر کے۔ آخر ہم بھی تو اُن کے زرخرید نہیں
کوئی کھال ہیں۔ آج اگر ہمیں کوئی ایسی ضرورت
ئے بنا نہ بنتی۔ تو کیا وہ اپنی بیگم کو ہمارے

میاں۔ مجھے یقین ہے۔ کہ ضرور بھیج دیتے۔ جو پوتڑوں کے امیر ہوتے ہیں۔ اُن کا دماغ خدا نے غریبوں کی طرح چھوٹا نہیں بنایا۔ کتنا عرصہ ہُوا ہے۔ جبکہ مَیں بیمار تھا۔ اور نواب صاحب مجھے پُوچھنے کے واسطے آئے تھے۔ پھر اُن پر ہی کیا موقوف ہے۔ باری باری ان کے سب بیٹے پُوچھنے کو آئے۔

بیوی۔ اے آئے تو کون احسان کیا۔ اپنی غرض کو آئے۔

میاں۔ غرض کیا تھی؟ کیا تم اُنہیں تنخواہ دیتی تھیں؟

بیوی۔ غرض یہ تھی۔ کہ بیٹی مانگتے تھے۔

میاں۔ دُرست ہے۔ وہ جس قدر غریبوں کی خدمت کرتے ہیں۔ اُن سب کی بیٹیاں لینی منظور ہونگی۔

بیوی۔ امیری کا گھمنڈ نہیں۔ تو لڑکی کو یہاں بھیج دیتے۔ پیاسا کنوئیں کے پاس جاتا ہے۔ یا کنُواں پیاسے کے پاس آتا ہے؟

میاں۔ تمہاری عقل کے بھی قربان ہونا چاہیئے۔ غریب سے غریب بیمار بھی ڈاکٹر تک نہیں جاتا۔ اور وہ تو ضرور آئیں گی۔

ابھی ان دونو میاں بیوی میں بحثا بحثی ہو رہی تھی۔ کہ باہر سے آواز آئی "میر صاحب۔ حضُور نواب صاحب آپ کو بُلاتے ہیں"۔

میر صاحب۔ (اندر سے پُکار کر) کہ دو کہ ابھی حاضر ہوتا ہوں۔

یہ کہہ کر صفیہ کی طرف اشارہ کیا۔ کہ اُٹھو بیٹا تم تیار ہو جاؤ۔ مَیں اُن سے وعدہ کر چکا ہوں۔ ضرور تم کو بھیجوں گا۔ یہ کہہ کر خو

نواب صاحب ۔ آپ نے تو بہت دیر کر دی ۔ میرا گھر پر اِنتظار ہوگا ۔ کہئے برخورداری کو چلنے پر آمادہ کیا یا نہیں ؟

میر صاحب ۔ اجی اُسے کیا عُذر ہے ۔ اُس کی والدہ ذرا کہتی تھیں ۔ کہ لڑکی کا گھر سے باہر جانا اچھّا نہیں ؛

نواب صاحب ۔ یہ آپ کا کیا خیال ہے ؟ آپ کا اور ہمارا گھر خانہ واحد ہے ۔ صفیہؔ جیسی آپ کی بیٹی ۔ ویسی میری بیٹی ۔ آپ یقین کریں ۔ میں اسے بالکل اپنی شہنشاہ بیگم کی طرح جانتا ہوں ۔ اگر بھابی کو ایسا ہی خیال ہے ۔ تو مَیں ایسا انتظام کر دُوں گا ۔ کہ وہ صرف بیمار کو دیکھیں اور بیمار اُن کو ۔ اس کے سوا اَور کوئی گھر کا آدمی اُن کے پاس نہ آئے گا ؛

میر صاحب ۔ یہ سب آپ کی بندہ نوازیاں ہیں ۔ مجھے تو کسی قسم کا عُذر نہیں ۔ کہئے مَیں ابھی صفیہؔ کو بھیجتا ہُوں ؛

نواب صاحب ۔ تو اچھّا مَیں اب جاتا ہوں ۔ اگر کہئے تو صفیہؔ کے واسطے فٹن چھوڑے جاؤں ۔ یا فینس بھیج دوں ؟

میر صاحب ۔ آپ تکلیف نہ کریں ۔ صفیہؔ ڈولی میں آجائے گی ؛

نواب صاحب تو سلام علیکم کہ کر رُخصت ہوئے ۔ اور صفیہؔ کا باپ ڈولی کو آدمی بھیجوا کر آپ اندر گیا ۔ کہ دیکھوں ۔ صفیہؔ تیار ہُوئی یا نہیں ۔ کہ بیوی پھر اُلجھیں ؛

بیوی ۔ مَیں نے تو سُنا تھا ۔ کہ اُن کی بیٹی کے ہاں لڑکا ہُوا ہے ؛

میاں ۔ ہاں لڑکا پانچ چھ روز کا ہے ۔ لڑکی کو سخت بخار ہو گیا ہے ۔ ... جھٹک رہی ہے ؛

بیوی۔ جانے کیا بیماری ہوگئی ؟

میاں۔ اب تو دیکھنے ہی سے معلوم ہوگا ❊

بیوی۔ وہ آج کل زچہ ہے۔ زچہ کو اچھے بُرے سب طرح کے مرض ہوتے ہیں ایک مرض بتانے کا ہُوا۔ ایک نہ بتانے کا ہُوا ۔ اُن لوگوں کی بھلی کہی ! جب اُنہیں کنواری لڑکی کو بُلانے کا کچھ خیال نہ ہُوا۔ تو واہی تباہی بکتے کیا شرم ہوگی؟

میاں۔ بیماری میں اگر شرم و لحاظ ڈھونڈا جائے تو انسان مر رہے ❊

بیوی۔ تم تو شرم کو دھو کر پی گئے ہو ۔ سچ ہے۔ امیری بُری بلا ہے - ابھی کوئی غریب صفیہ کو بُلانے آتا۔ تو دیکھتے تم صفیہ کو کس طرح بھیج دیتے ؟

میاں۔ تم تو احمق ہو۔ تمہارے ساتھ کون مغز زنی کرے ؟

اتنے میں کہاروں نے دروازے پر آواز دی۔ حُضور ڈولی ❊

صفیہ کا باپ۔ (صفیہ سے) لو اُٹھو بیٹا ! سوار ہو۔ خدا آ رکھے۔ کہ تم بیماری کو ٹھیک طرح پا جاؤ۔ لو اللہ حافظ سوار ہو

صفیہ اور صفیہ کی ماں دونو ڈولی میں سوار ہو نواب صاحب کے مکان پر پہنچ گئیں ۔ وہاں نواب صاحب نے واقعی ایسا انتظام کروا رکھا تھا۔ کہ صفیہ جب اُن کے گھر میں اُتری۔ تو دروازے پر نواب کی دونو چھوٹی بے بیاہی لڑکیاں کھڑی تھیں ۔ صفیہ کی ماں کو اُنہوں نے جُھک کر سلام کیا ۔ ایک لڑکی صفیہ کی ماں کو لے کر اپنی ماں کے کمرے میں چلی گئی۔ اور دُوسری لڑکی صفیہ کو اپنی بیمار بہن کے کمرے میں لے گئی ❊

صفیہ نے جا کر دیکھا۔ کہ نواب کی بیٹی بیہوش پڑی ہے - ۱۸٫۱

میں پھنک رہی ہے۔ اور بالکل بے ہوش ہے۔ صفیہؓ نے جیب میں سے تھرمامیٹر نکالا۔ اور ٹمپریچر دیکھا۔ تو ایک سَو پانچ درجے کا بُخار تھا۔ پُوچھا۔ کہ یہ حالت کب سے ہے۔ اور اب تک ان کا کیا کیا علاج ہُوا +

نواب صاحب کی لڑکی نے سارا حال سنایا۔ اور سب نسخے لاکر دکھائے۔ اور کہا۔ کہ حکیم صاحب کا علاج ہے۔ وہ ابھی دیکھ کر گئے ہیں۔ اور کہ گئے ہیں کہ سرکے اور گلاب میں کپڑا بھگو کر ماتھے پر رکھو +

صفیہؓ۔ بخار شدید ہے۔ اور دماغ کی طرف گرمی کا بہت زور ہے۔ ماتھے پر سرکے اور گلاب میں تر کیا ہُوا کپڑا رکھنے سے خاطر خواہ فائدہ کی اُمید نہیں ہے۔ ان کا فوراً پاشویہ ہونا چاہئے۔ جلدی سے نتیڑے میں پانی گرم کروائیے۔ ایسی ٹب منگوائیے۔ جس میں دونوں پاؤں گھٹنے تک ڈوب سکیں۔ کہئے۔ کہ جلدی سے مُٹھی بھر رائی بھی بازار سے لے آئے +

پانی میں اس کے ڈالنے سے زیادہ فائدہ ہوگا۔ اور جب تک پاشویہ ہو رہا ہو۔ گلاب اور سرکے کا کپڑا ماتھے کے بجائے تمام سر پر رکھئے۔ اور اسے جلدی جلدی بدلتے رہئے۔ کہ وہ گرم نہ ہونے پائے + بس آپ جائیے۔ دیر نہ کیجئے +

سلطانہ بیگم۔ (نواب صاحب کی چھوٹی بیٹی) تو میں امّاں جان سے پوچھ آئُوں +

صفیہ۔ تمہاری مرضی پوچھ لو +

سلطانہ بیگم اپنی ماں کے پاس گئی۔ اور جا کر کہا۔ کہ آپا تو پاشویہ کرنے

کو کہتی ہیں ۔

بیگم۔ اُسے ہٹے۔ کہیں ایسا کام نہ کریں۔ لڑکی کو ہوا لگ جائیگی۔ تو اُلٹے لینے کے دینے پڑ جائیں گے ۔

سُلطانہ اپنی ماں سے یہ سُن کر صفیہ کے پاس آئی ۔

صفیہ۔ کہو اماں جان نے کیا فرمایا؟

سلطانہ۔ وہ تو پاشویہ کو منع کرتی ہیں ۔

صفیہ۔ وہ کیوں؟ کیا اُنہوں نے کبھی اس میں کچھ نقصان ہوتے دیکھا ہے؟

سلطانہ۔ یہ تو خبر نہیں۔ وہ کہتی ہیں۔ کہ ہوا لگ جائیگی ۔

صفیہ۔ نہیں ہوا کیوں لگے گی۔ اس کا انتظام کیا جائیگا۔ اس قسم کے بخار کو پاشوئے سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ تُم اُن سے کہ دو۔ کہ وہ اطمینان رکھیں مَیں ذمہ وار ہُوں۔ ایک تنتیڑے میں خُوب پانی گرم کراؤ ۔

سلطانہ نے ماں سے کہا۔ آپا کہتی ہیں۔ کہ مَیں ذمے وار ہوں۔ آپ کو کچھ نقصان نہ ہوگا۔ بلکہ فائدہ ہوگا ۔

بیگم۔ خدا اُن کی زبان نیک کرے۔ اور میری بچّی کو آرام ہو جائے ۔

والدہ صفیہ۔ اے نہیں بیٹی تم صفیہ سے کہ دو۔ کہ کہیں کچھ اناپ شناپ نہ کر بیٹھے۔ جس بات پر بیگم صاحبہ کا دل نہیں جمتا۔ اُسے ہرگز نہ کرے۔ ایسا نہ ہو۔ کہ کچھ اَور خرابی نہ ہو جائے ۔

سُلطانہ نے صفیہ سے سب حال کہا۔ اُس نے کہا۔ کہ تم

بھی دو۔ بسم اللہ کر کے گرم پانی لاؤ۔ ہماری امّاں تو یُوں ہی وہم کیا کرتی ہیں ؞

صفیہ نے کمرے کا دروازہ اور روشن دان بند کر کے بہت ہی احتیاط سے شہنشاہ بیگم کو پاشو یہ کروایا۔ اور پھر اُوپر بھاری کپڑا ڈال کر لٹا دیا۔ جیب گھڑی کھول کر سامنے رکھ لی ؛ بیس منٹ کے بعد ٹمپریچر لیا۔ تو بُخار ایک سَو درجے پر اُتر آیا تھا ؛ شہنشاہ بیگم نے آنکھیں کھول دیں ؛ صفیہ کو پہچان کر سلام کیا ؛ صفیہ نے سلام کا جواب دے کر خیریت پوچھی ؛ اتنے ہی میں تمام گھر میں مبارک سلامت ہونے لگی۔ کہ صاحبزادی کو آرام ہو گیا ؛ صفیہ نے سلطانہ سے کہا۔ کہ بُوا تم اپنی امّاں جان کو شوق سے بُلا لو۔ وہ میری بُزرگ ہیں۔ مجھے اُن سے کوئی پردہ نہیں ہے ؛ مَیں نے پہلے اس لئے نہیں بُلایا۔ کہ شاید وہ میری ان تدبیروں سے گھبرائیں ؛ سُلطانہ گئی۔ اپنی اور صفیہ کی ماں کو بُلا لائی ؛ سلطانہ کی ماں نے بیٹی کو ہوش و حواس میں دیکھ کر چٹ چٹ اس کی بلائیں لیں ؛ پیار کیا۔ پھر صفیہ کی بلائیں لیں۔ اس پر ..ری صدقے ہوئیں۔ کبھی صفیہ کے ہاتھ چُومتی تھیں۔ اور کبھی اس کو دُعائیں دیتی تھیں ؞

صفیہ نے نہایت ادب سے کہا۔ کہ اگرچہ اُن کا بخار کم ہو گیا ہے۔ مگر ابھی خطرہ موجود ہے ؛ ایسا نہ ہو کہ خدانخواستہ پھر حرارت بڑھ جائے ؛ اس واسطے آپ فی الحال اتنی احتیاط کریں۔ کہ اُن کے کمرے کو ہوا سے بچائیں۔ اور گرم رکھیں۔ اور بہت سی عورتوں کا شور و غل بھی نہ ہونے دیں ؛ مَیں گھر سے

لے در.. معلوم کیا ؞

کوئی نسخہ لکھ کر ارسال خدمت کروں گی۔ اب مجھے اجازت دیں۔ سُلطانہ
کی ماں نے بہت دُعائیں دیں۔ اور ایک نہایت پُرزر جوڑا طشت میں لگا
کر لائیں۔ عطر و پان سے خاطر کی۔ صفیہ نے عطر اپنی ماں کو لگا دیا۔ اور
پان کا بیڑا اسلام کرکے آپ کھا لیا۔ اور کپڑوں کے جوڑے کو شکریے کے
ساتھ واپس کر دیا۔ مگر سُلطانہ کی ماں بہت رنجیدہ ہُوئیں۔ اِدھر سُلطانہ ایک
نہایت خوب صورت صندوقچہ اُٹھا لائی۔ کہ اچھّی بہن یہ میری طرف سے
میری نشانی قبول کرو۔

صفیہ۔ بہن خدا تم کو ہمیشہ زندہ رکھے۔ تمہاری نشانی کی کیا ضرورت ہے؟
تم مجھ سے ایسی محبّت سے پیش آئی ہو۔ کہ مَیں تمہاری ان پیاری پیاری باتوں
ہی کو کبھی نہ بھُولوں گی۔ غرض صفیہ نے قایل معقول کرکے جوڑا اور
صندوقچہ تو واپس کر دیا۔ اور خود جب شہنشاہ بیگم کے بچّے کو پیار کرنے
کے لئے گود میں لیا۔ تو ایک اشرفی بٹوے میں سے نکال کر اس کے ہاتھ
پر دھری۔ اس پر نواب بیگم بولیں۔ کہ لو اَور نرالی دیکھو۔ ڈاکٹر کو فیس دینی
چاہیئے۔ یا اَور اُس سے اُلٹی چھٹی لینی چاہیئے۔ تُم نے تو ہمارے ہاں کی
کوئی چیز قبول نہیں کی۔ کہو ہم تمہارا دین کس طرح رکھ لیں؟

صفیہ۔ یہ سب کچھ آپ ہی کا ہے۔ اب کہیں بھلا میرا لینے کا کیا موقع تھا۔
جو مَیں جوڑا لیتی۔ آپ محبّت و اخلاق سے پیش آئیں۔ مَیں اُس کا ہی
احسان نہیں اُتار سکتی۔ اور یہ تو میرا بھانجا ہے۔ مَیں نے غریبی موجب
اس کے کُرتے ٹوپی کو دیا۔ اس سے کسی کو کوئی مطلب نہیں۔ غرض کہ جب

باتیں ہوہوا کر صفیہؔ رخصت ہو کر گھر پہنچ گئیں ؎

باپ نے آتے ہی صفیہؔ سے حال پوچھا۔ کہ کہو بیٹی کیا پیش آیا؟ اُس وقت صفیہ کی ماں کا مزاج بھی راہ پر تھا۔ خوشی خوشی سب باتیں کیں۔ اور نواب بیگم کی بہت کچھ تعریف کی ؎

صفیہؔ کا باپ۔ بیٹی صفیہؔ بات تو تب ہے۔ کہ اب تمہارے علاج سے نواب صاحب کی لڑکی کو کُلّی صحت ہو جائے۔ تب مَیں جانوں گا۔ کہ مَیں نے تمہیں جس قدر لکھایا پڑھایا۔ سب وصول ہو گیا ؎

صفیہؔ۔ ابّا جان یہ سب خدا کے اختیار کی بات ہے۔ جہاں تک مجھے آتا ہے مَیں بھی فرق نہ اُٹھا رکھوں گی۔ مگر آپ ذرا مس صاحبہ (لیڈی ڈاکٹر) کو بُلوا دیں۔ تاکہ مَیں اُن کو اپنا تجویز کیا ہُوا نسخہ وغیرہ سب بتا کر اُن سے رائے لے لوں ؎

باپ۔ ہاں یہ بہت مناسب ہوگا۔ مَیں ابھی گاڑی بھیجتا ہُوں۔ اور مس صاحبہ کو بُلواتا ہوں ؎ صفیہؔ کا باپ ابھی یہ ذکر مذکور کر ہی رہا تھا۔ کہ باہر سے آواز آئی "ہم آویں" ؎

صفیہؔ۔ لو مس صاحبہ تو خود ہی آگئیں ؎ صفیہ کا باپ اُٹھا۔ اور مس صاحبہ کو اپنے ساتھ لوا لایا ؎ صفیہؔ نے مس صاحبہ سے ہاتھ ملایا۔ اور معمولی صاحب سلامت کے بعد کہا۔ کہ آپ کی عمر بہت بڑی ہے ؎

مس صاحبہ۔ یہ تم کو کیونکر سے معلوم ہُوا؟

صفیہؔ۔ مَیں تو آپ کی اِس وقت یاد ہی کر رہی تھی۔ کہ آپ آن پہنچیں ؎

مس صاحبہ۔ تو کیا اس سے عمر بڑھ جاتا ہے؟
صفیہ۔ نہیں ہم لوگ جب کسی کو یاد کرتے ہیں۔ اور وہ اُسی وقت آجائے تو یہی کہا کرتے ہیں۔ کہ اس کی عُمر بڑی ہے +
مس صاحبہ (ہنس کر) او۔ اس کا مطلب ہم اب سمجھا + اچھا تو آپ مجھے کیوں یاد کیا تھیں؟ افسوس کہ مَیں کئی دن سے تمہیں نہیں ملنے سکی +
صفیہ۔ مس صاحبہ کیا کہوں؟ آج تو مَیں ایک جگہ بڑی پھنسی + یہاں ہمارے مکان کے پاس جو نواب صاحب رہتے ہیں۔ اُن کی لڑکی بہت بیمار ہے + مجھے بُلاوا آیا۔ کہ مَیں اسے چل کر دیکھوں۔ سو مَیں وہاں گئی + مَیں نے اُنہیں دیکھا + بُخار ایک سَو پانچ درجے تک تھا + کُچھ بے احتیاطیاں بھی ہو رہی تھیں + مَیں نے بُخار کی کمی کے واسطے پاشویہ کروادیا + اب (نسخہ دکھا کر) یہ نسخہ اُن کے مرض کے واسطے لکھا تھا۔ اور یہ غذائیں اُن کے واسطے تجویز کی تھیں + آپ خُوب موقع پر آگئیں۔ مہربانی کر کے دیکھیں کہ یہ نسخہ وغیرہ سب مناسب ہے یا نہیں؟
مس صاحبہ نے مریضہ کا پُورا حال دریافت کیا۔ اور سب سُن کر بولیں +
مس صاحبہ۔ ڈیر صفیہ مَیں تم کو اور تمہارے ماں باپ کو مُبارکبا د دیتی ہوں۔ کہ تم اب اچھی ہوشیار لیڈی ڈاکٹر بن گیا ہے۔ تم سے بہتر تجویز میں مَیں خود اس مرض میں نہ کرنے سکتی۔ تم بری لایک بن گیا +
صفیہ۔ یہ سب آپ کی ہی مہربانی ہے۔ ورنہ میں کیا اور میرا کیا + اگر آپ مجھ پر مہربانی نہ فرماتیں۔ تو میں یہ سب باتیں

مجھے کچھ بھی نہ آتا۔ میں آپ کی اس قدر احسان مند ہوں۔ کہ زندگی بھر آپ کی مہربانیوں کو نہ بھولوں گی ؂

مس صاحبہ۔ خدا کا بہت بہت شکر ہے۔ کہ ہمری محنت اب ٹھکانے لگی۔ اچھا تم یہ نسخہ اور تجویزیں سب کچھ لکھ کر نواب صاحب کے ہاں بھیج دو ؂

صفیہ نے نسخہ اور ایک خط جس میں چند ہدائتیں پرہیز اور کھانے پینے وغیرہ کی نسبت لکھی تھیں۔ ایک لفافہ میں بند کرکے باپ کو دیا۔ باپ وہ لفافہ خود جا کر نواب صاحب کے ہاں دے آیا ؂

صفیہ کے دوا معالجے سے شہنشاہ بیگم کو صحت دینی خدا کو منظور تھی + اس کا دوا علاج ایسا راس آیا۔ کہ وہ گھڑیوں میں صحت پانے لگی + صفیہ کی تجویز کی ہوئی دواؤں اور زود ہضم و مقوی غذاؤں نے شہنشاہ بیگم کا رنگ کندن کی طرح دمکایا + جب شہنشاہ بیگم خیر سے چلّہ نہا کر اُٹھیں۔ تو اُن کے ہاں کی خوشی اور منّت مُرادوں کا کیا ٹھکانا تھا؟ نواب بیگم آپ ڈولی کرا کر میر اصغر حسین کے ہاں آئیں۔ اور صفیہ اور صفیہ کی ماں کو اپنے ساتھ مکان پر لائیں + نواب صاحب کی بیٹی کا شفا پانا تھا۔ کہ صفیہ کے ہاں بیمار عورتوں اور بچّوں کا ہجوم ہونے لگا + کوئی کان کے درد کی دوا مانگتی ہے۔ تو کوئی پھوڑے پھنسی کو چھُوانے آئی ہے۔ کوئی اپنے بیمار کو لئے چلی آتی ہے۔ غرض صفیہ کا گھر ایک خاصہ ہسپتال کا نمونہ نظر

صفیہ کا باپ اپنی بیٹی کی عقل و دانش کو دیکھ دیکھ کر پھُولا نہ ... پُرانے وقت کی بی بی تھیں۔ اُن کو یہ بھی بُرا لگا۔ کہ

گھر میں ہر ایک چھوٹی بڑی ہر قوم کی عورت کیوں آتی ہے؟ اور صفیہ اُن کا علاج کیوں کرتی ہے؟

آخر ایک روز بگڑیں اور بولیں۔ صفیہ!

صفیہ۔ جی اماں جان:۔

ماں۔ ادھر آؤ:۔

صفیہ (ماں کے پاس آکر) فرمائیے:۔

ماں۔ مَیں کہتی ہوں۔ کہ اب تم خیر سے اپنا یہ ہسپتال بڑھاؤ۔ مجھے تمہارے یہ ڈھنگ ایک آنکھ نہیں بھاتے:

صفیہ کا باپ۔ کیوں صاحب اس میں تمہیں کیا عیب نظر آیا؟

بیوی۔ عیب ساعیب ہے؟ جوان بیٹی کا گھر دیکھو۔ اور اس میں اچھی بُری عورتوں کا آنا دیکھو۔ مَیں باز آئی ایسے معالجوں سے۔ چولہے بھاڑ میں پڑیں ایسے ہُنر:۔

میاں (ہنس کر) مجھے خطرہ ہے۔ کہ لڑکی کہیں تمہاری ہی نظروں کی نذر نہ ہو جائے۔ وہ جو اچھا کام کرتی ہے تمہیں وُہی بُرا لگتا ہے۔ تمہاری طرح جاہل اَن پڑھ رہتی۔ تو تم خُوش ہوتیں:۔

بیوی۔ نگوڑے جاہلوں کو خدا تھوڑا ہی پُوچھتا ہے؟ تمہارے ہاتھ رزق ہوتا۔ تو تم جاہلوں کو بے آب ودانے ہی کے مار ڈالتے۔ شکر ہے تمہاری بیٹی نے پڑھ کر چار دیدے کر لئے۔ درگور ایسا علم۔ جھاڑو پھیروں ایسی لیاقت پر۔ نہ بیٹیوں والا ڈھنگ ہے نہ تمیز۔ سینے پرونے کی رہی او

سکھانے پکانے کی۔ کر رہی ہے تو کیا بُت بنا رہی ہے۔ پھوڑے۔ پھُنسی چہرے۔ لہو پیپ میں ہاتھ لبیڑے بیٹھی ہے۔ یا کتاب لئے کُرسی پر ٹنگی ہے۔ یہ اچھّے ڈھنگ سکھائے ہیں! خُدا ہی ہے۔ جو کسی گھر میں ان ڈھنگوں کی سمائی ہو۔ میں تو اُس دن کو جھینکتی ہُوں جس دن یہ بیمار پڑی تھی۔ اور اُس مُوئی فرنگن کو بُلایا تھا۔ بس میری بچّی کو تم نے بگڑوا دیا۔ یا اُس نے لکھوایا۔

میاں۔ تو کیا صفیہ کو سینا پرونا اور کھانا پکانا نہیں آتا؟ ذرا تم اُس کی سلائی سے اپنی سلائی تو ملاؤ۔ ذرا تم گنتی تو کراؤ۔ کہ تم اپنی معمولی دال پھلکے کے سوا کتنے انگریزی کھانے پکا جانتی ہو؟

بیوی۔ اے دُور کرو نگوڑے انگریزی سڑاندھے بساندھے کھانوں کو۔ جن کو کھا کر بیماروں کا سامنہ ہو جائے۔

میاں۔ (ہنس کر) تو کیا وہ اپنے دیسی کھانے پکانے نہیں جانتی؟

بیوی۔ جانتی ہے۔ تو کس کام کے؟ جب وہ ہنڈیا چُولھے کے کام سے ہی کوسوں بھاگتی ہے۔ فدا کی ذرا چُولھے کنے آئی بھی۔ تو ایسے جیسے چھُدا اُتارنے آتی ہیں۔ برتنوں کو دھلوائے گی۔ کہ نگوڑوں کی قلعی بھی اُتروا پھینکے گی۔ اور پھر بھی یہ وہم کہ ابھی صاف ہی نہیں ہوئے۔ ان باتوں کی سمائی ساس نندوں کے آگے نہیں۔ دیکھو میں کہے دیتی ہوں۔ کہ یہ ڈھنگ اچھّے نہیں ہیں۔

میاں۔ خیر تم اپنی رائے کو رہنے دو۔ وہ دن تو آئے۔ دیکھا جائے گا۔

بیوی۔ بس تم نے حمایت لے لے کر لڑکی کو بے بہرہ کر دیا ہے۔ تم جانو اپنی کی آپ ہی بھگتا کرنا۔

صفیہ کی ماں کا مزاج عجب طرح کا واقع ہوا تھا۔ جب وہ خوشی میں آتی تھی۔ تو صفیہ کے ہنروں اور لیاقتوں کی تعریف کے پُل باندھ دیتی تھی۔ اور جب اس کو جنون اُٹھتا۔ تو پھر وہ ہر ایک ہنر میں ایک نہ ایک عیب نکال کر جھگڑنے لگتی تھی۔ مگر ساتھ ہی صفیہ کا باپ نہایت ہی حلیم الطبع سیدھے سادے مزاج کا انسان تھا۔ بیوی بعض وقت اُسے بہتیری اُلٹی سیدھی سُنا لیتی تھی۔ مگر وہ ہمیشہ ہنس کر ٹال دیتا تھا۔ اور بیوی سے کبھی ناراض نہ ہوتا۔ صفیہ کا مزاج بھی بالکل اپنے باپ کا سا تھا۔ وہ اپنی ماں کے کہنے کا ذرا رنج نہ کرتی تھی۔ بلکہ اُس کو اپنی حقیقی خیر خواہ اور دردمند سمجھتی تھی۔ اور اس کے ساتھ بے انتہا محبّت رکھتی تھی۔

باب سوم

آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجے
جاتا ہو تو اُس کا غم نہ کیجے

صفیہ اب ماشاء اللہ پوری جوان ہو گئی ہے۔ آہ اب اس کے واسطے وہ وقت آگیا ہے۔ اور وہ عمر آن پہنچی ہے۔ جس عمر میں

اپنی پھول سی لڑکی آنکھوں میں کھٹکنے لگتی ہے۔ اور وہ رات دن اس جگر کے ٹکڑے کی علیحدگی کی تجویزیں سوچتی ہے۔ صفیہ کی ماں کو نہ صرف آج سے بلکہ مدّتوں پہلے سے اس فکر نے گھیر رکھا تھا۔ کہ ہائے بیٹی جوان ہوگئی۔ اب اس کا کچھ فکر کرنا چاہیئے۔ لیکن ہم سچ کہیں گے۔ کہ اس وقت تک صفیہ کے ماں باپ نے صفیہ کو اس طرح رکھا جس طرح کوئی اپنی آنکھوں کی پتلی کو رکھتا ہے۔ وہ اس کو اب جُدا کرنا چاہتی تھی۔ تو صرف زمانے کے خیال سے۔ اور دل پر پتھر کی سِل رکھ کر۔ اُن کو خدا نے اس قدر دے رکھا تھا۔ کہ وہ صفیہ کے سینکڑوں نوکروں کے بوجھ سے بھی گھبرانے والے ماں باپ نہ تھے۔

ایک روز جب اصغر حسین (یعنی صفیہ کے ابّا) گھر میں آئے۔ تو صفیہ کی ماں نے موقع پاکر اُن سے کہا۔ کہ اب خیر سے لڑکی جوان ہوگئی ہے۔ اس کا کچھ فکر کرنا چاہیئے۔

میاں۔ اُونھ۔ بڑی جوان ہوگئی ہے! جوان نہیں بُوڑھی ہوگئی ہے! ابھی سے شادی کی کیا جلدی پڑی ہے۔ ناحق شادی ہو کر دُنیا کے بکھیڑوں میں پھنس جائیگی۔ ایسی جلدی شادی کرنا کوئی ضرور نہیں۔ دیکھا جائیگا۔

بیوی۔ لو اَور سُنو۔ تو کیا ساری عُمر گھٹنے سے لگائے بٹھائے رکھوگے؟

میاں۔ اَور کیا کریں گے؟ کہیں پھینک تھوڑا ہی دیں گے۔

بیوی۔ چاہے تم گھٹنے ہی سے لگائے رکھو۔ پر اپنے فرض سے تو سبکدوش ہو۔ سُنتی ہوں۔ کہ لڑکا بالکل بے کہا ہوا جاتا ہے۔ اگر اُس کے

پاؤں میں جلدی بیاہ کی بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ تو وہ کچھ توڑ کے گا۔ مجھے صفیہ سے زیادہ تو اُس لڑکے کا دھیان ہے ٭

میاں۔ یہ سب تمہاری ہی مہربانی ہے ٭

بیوی۔ لو اَور سنو! کیا میں نے اسے بگاڑا ہے ؟

میاں۔ بگاڑنے کا کیا مذکور ؟ نہ تم بھابی سے حامی بھرتیں۔ اور نہ یہ رشتہ مستحکم ہوتا ٭

بیوی۔ تو مجھے کیا خبر تھی۔ کہ بڑے ہو کر اُس کے ایسے لچھن ہونگے ٭

میاں۔ یہ خبر تو تمہیں ضرور ہوگی۔ کہ وہ بڑا ہو کر ضرور لائق اور ہونہار ہوگا ٭

بیوی۔ تو اب مجھ سے لڑائی اُلٹی کیوں لڑتے ہو؟

میاں۔ اس میں اُلٹی اور سیدھی لڑائی کیسی ؟ جو کہتا ہوں بجا کہتا ہوں یا غلط ؟

بیوی۔ تو تمہیں بھی اسی وقت بجا اور بے جا کا موقع سوجھا ہے ؟ پہلے کچھ نہ کیا ٭

میاں۔ تم ہی کہو۔ کہ جب تم اور لڑکے کی ماں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا تھا۔ تو مجھ سے کچھ پوچھا تھا ؟

بیوی۔ اے تو تم سے پوچھا نہیں تو میں نے چھپایا ہی کیا تھا ؟ عیدی تہواری جو کچھ آتی رہی۔ تمہارے آگے آئی۔ پھر کوئی غیر جگہ تو تھی ہی تمہارا ہی بھتیجا ہے ٭

کہوں میں نے پہلی ہی عید پر تمہیں دو کا تقاضا یا نہیں؟ کہ تم اس قسم

کے لین دین مت رکھو۔ جب لڑکا لڑکی جوان ہونگے۔ تب دیکھا جائے گا*
بیوی۔ باتوں کی طرح بات کر دی تھی۔ تو اس سے میں کیا جانتی۔ کہ تمہاری رضامندی ہے یا نہیں*
میاں۔ تو اَور کیا میں لاٹھی لے کر تمہارے سر پر سوار ہوتا۔ تو تم یہ جانتیں کہ میری رضامندی نہیں ہے + میں تو اب بھی کہتا ہوں۔ کہ اس رشتے کو جانے دو*
بیوی۔ تمہارے کیا کہنے ہیں! نہ تمہیں نک کٹائی کا رنج۔ نہ جگ ہنسائی کی شرم + سولہ سترہ برس کا کیا کرایا رشتہ اب ضرور چھڑایا جائیگا؟
میاں۔ جب ہی تو کہتے ہیں۔ کہ عورتوں کی عقل اَوندھی ہوتی ہے + اللہ جانتا ہے۔ کہ اگر مجھے تمہارا خیال نہ ہو۔ تو میں آج صفیہ کا رشتہ توڑ دوں۔ اس میں عیب ہی کیا ہو جائیگا؟
بیوی۔ اس رشتے کو توڑ کر تمہاری بیٹی کو اچھا بر بھی ضرور ملے گا*
میاں۔ نہیں۔ بھلا بر کیوں ملنے لگا تھا؟ دُنیا میں ایک صفدر رہی تو انسان رہ گیا ہے + بھلا اس سے اچھا اَور کوئی ہونا ہے؟
بیوی۔ اے جاؤ بیٹھو بھی۔ تم ان باتوں کو جانتے بھی ہو؟ آج منگنی چھوٹ جائے۔ تو سارے جہان میں رُسوائی ہو۔ کہ جانے لڑکی میں کیا عیب نکلا۔ جو سولہ سترہ برس کی منگنی چھوٹ گئی + پھر کوئی بھلا مانس تو تمہارے گھر کی طرف ضرور ہی رُخ کرے گا؟
میاں۔ اوہو بھلا کیوں رُخ کرنے لگا تھا؟ بیٹی کو کنوئیں میں گرا

بچا کر تو مَیں ایسا ہی مردُود ہو جاؤں گا۔ کہ کوئی میرا مُنہ دیکھنے کا روادار بھی نہ رہیگا ٭

بیوی۔ اے توبہ! تو تُم لڑتے جھگڑتے کیوں ہو ۔ اب تو جو ہو گیا سو ہو گیا۔ صفیہ کا سنجوگ صفدر ہی کے ساتھ ہے۔ وہ تو وہیں بیاہی جائیگی ٭

میاں۔ ہاں تو تم اولیا ہی ہو۔ تمہیں یہ خبر بھی ہو گی ؟

بیوی۔ تو کیا اس میں اب کچھ شک بھی ہے ؟

میاں۔ تم اپنی بات کی پکّی رہو۔ تو شک کیوں ہونے لگا تھا ؟

بیوی۔ میری تو جان جائے گی۔ پر آن نہ جائے گی ۔ ایک دفعہ زبان دے چکی ہوں ۔ اب چاہو اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے۔ چاہے اسی بچی کا نیک نصیبا ہو۔ تو یہ ترے چاہے ڈُوبے۔ دُونگی تو صفدر ہی کو بیٹی دُونگی ٭

میاں۔ تو کنوئیں میں نہیں دھکیل دینیں ؟

بیوی۔ اَور کسی نے اولاد کو کنوئیں میں ڈالا ہو۔ تو مَیں بھی ڈال دُوں۔ زمانہ بیٹا بیٹیاں بیاہتا آیا ہے۔ مَیں بیٹی بیاہوں گی۔ تو کون اس کے ساتھ دشمنی کروں گی ۔ مَیں جنم کی ساتھی ہوں۔ کرم کی ساتھی تو نہیں نیک نصیب ہونگے۔ تو کنکر پتھر اس کے واسطے ہیرا جواہر ہو جائیں گے - اور جو نصیب ہی بھلے نہ ہُوئے۔ تو لاکھ اچھی جگہ دیکھ کر دو جو پیش آنا ہے سو ہو کر رہے گا ٭

میاں۔ آنکھوں دیکھے تو مکھی کوئی نہیں نگلتا ۔ یہ ارمان تو نہ رہے کہ جان بوجھ کر بچی کو ڈبو دیا ٭

بیوی۔ بس صاحب اب تو جو کچھ ہُوا سو ہُوا + اب تم اِن باتوں کو جانے دو۔ اور تن بہ تقدیر بھائی کو خط لکھ دو ؂

میاں۔ دیکھو تم جانو + کل کلاں کو اگر بیٹی پر کوئی مشکل آن بنی۔ تو پھر یہ نہ کہنا۔ کہ تم نے کچھ نہیں کیا۔ مَیں تو اب بہتیرا مغز مار چکا ہوں + اب تم اپنی ہی آن پُوری کر لو۔ لاؤ قلم دوات۔ مَیں بھائی کو خط لکھ دوں ؂

صفیہؔ کی ماں نے دوات قلم کاغذ لاکر آگے رکھ دیا۔ اور اصغر حسین نے بھائی کو خط لکھ کر یوں بیوی کو سُنانا شروع کیا:۔

برادر مُعظم مُکرم من سلامت

السلام علیکم۔ عرصہ سے آپ کی خیریت مزاج کا کوئی خط نہیں آیا + اُمید ہے۔ کہ آپ مع بال بچّوں کے خیریت سے ہونگے + صفیہ کی والدہ کئی روز سے مجھے آپ کی طرف خط لکھنے کی تاکید کر رہی تھیں۔ مگر مجھے سرکاری کام سے اتنی فرصت نہ ملتی تھی۔ کہ آپ کو جلد تر خط لکھ سکتا + صفیہ کی والدہ کا یہ خیال ہے۔ کہ لڑکی اب خاصی سیانی ہو گئی ہے + اپنی حیثیت اور مقدار کے موافق ہم اس کو جس قدر تعلیم و تربیت دے سکتے تھے۔ وہ بھی دے چکے ہیں + خانہ داری کا کام بھی اپنی بساط کے موافق وہ خاصہ سنبھال سکتی ہے + میرا ارادہ عرصے سے حج کے جانے کا ہو رہا ہے + اس کام کو کئے بغیر جانے سے بات مدّتوں پر جا پڑے گی + اس لئے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ جس قدر جلد ہو سکے۔ اِس کام کا سرانجام ہو جائے + خدا کے فضل سے جوان اور اس قابل ہو گیا ہے۔ کہ اب اُس پر

بہ تدریج خانہ داری کا بوجھ ڈالا جائے +

لیجئے اتنا لکھنے پایا تھا۔ کہ والدۂ صفیہ آگئیں+ اب وہ اپنی زبان سے جو کچھ کہتی ہیں لکھتا جاتا ہوں۔ وہ کہتی ہیں۔ کہ بھائی تم جانتے ہو۔ کہ میں آئے دن کی مریضین ہوں+ مجھے اپنی زندگی کا ذرا بھروسا نہیں+ مجھے یہ بڑا ارمان ہے۔ کہ جس طرح ہو حج کے فرض سے سبکدوش ہوں۔ اور نبی کے روضے کی زیارت سے آنکھوں کو ٹھنڈا اور دل کو شاد کروں+ جب تک وہاں سے آؤں۔ تب تک کون جئے اور کس کا راج؟ میں نے اپنی غریبی کے موافق اپنی گڑیا کے لئے جو کچھ ہو سکتا تھا۔ وہ سب سامان درست کر لیا ہے+ آپ طاہمی بھریں۔ تو کوئی تاریخ وساعت سعید اس کار خیر کے واسطے تجویز کی جائے+ برخوردار صفدر کو بہت بہت دُعا۔ اور بھابی صاحبہ کو سلام۔ و السلام

خاکسار اصغر حسین

اصغر حسین نے یہ خط لفافہ میں بند کر کے ڈاک میں ڈال دیا +

صبح کا وقت تھا۔ اصغر حسین کے بڑے بھائی اکبر حسین چائے پی کر فارغ ہوئے۔ اور اخبار پڑھ رہے تھے۔ کہ اُن کو چٹھی رسان نے آ کر وہ خط دیا+ بسم اللہ کر کے خط کو کھولا+ مضمون پڑھ کر باچھیں کھل گئیں+ خط ہاتھ میں لئے بیوی پاس آئے اور کہنے لگے۔ کہ لو جی خوش ہو+ اصغر حسین نے خط بھیجا ہے۔ کہ عقد کی تاریخ مقرر کرو +

بیوی۔ صفدر حسین تو مانتا ہی نہیں+ میں تو اُسے کئی روز سے سمجھا رہی ہوں

حیران ہوگئی ہوں۔ کہو اب میں کیا کروں؟
میاں۔ میں باہر جاتا ہوں + اُس کو میرے پاس بھیج دینا میں سمجھا بُجھا لونگا
تمہیں سمجھانا ہی نہیں آتا ۞
صفدر ابھی پڑے سوتے ہی تھے۔ کہ اُن کو باپ کی طلبی کا پیغام سُنایا
گیا + جلدی سے آنکھیں ملتے اُٹھ بیٹھے + ہاتھ مُنہ دھو باپ کو جا
سلام کیا ۞
باپ۔ بیٹا صفدر تم اس وقت تک سو ہی رہے تھے؟
صفدر۔ نہیں ابّا جان یُونہی لیٹا ہُوا کتاب دیکھ رہا تھا ۞
باپ۔ بیٹا تمہارے چچا کا خط آیا ہے ۞
صفدر۔ کیا لکھا ہے؟
باپ نے خط بیٹے کو دے دیا اور بیٹے نے پڑھا ۞
باپ۔ ہاں تو پھر تمہاری رائے میں کونسی تاریخ اس کار خیر کے لئے
مبارک ہو گی؟
صفدر۔ ابّا جان گُستاخی معاف کوئی تاریخ بھی مبارک نہیں ۞
باپ۔ یہ کیا بکواس ہے؟
صفدر۔ ابّا جان آپ جانتے ہیں۔ کہ مَیں آئے دن تو بیمار رہتا ہُوں +
پرسوں ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا تھا۔ اُنہوں نے مجھے اچھی طرح
دیکھا۔ اور کہا۔ کہ تمہارے شُش کی حالت قابلِ اطمینان نہیں ہے۔
اور سخت اندیشہ مرض سل کا ہے۔ اپنی خیر چاہتے ہو۔ تو لکھنے پڑھنے کو

سلام کرو۔ اور کسی خوشگوار آب و ہوا میں کچھ مُدّت رہو۔ یا سمندر کا سفر کرو +
باپ۔ جھک مارتا ہے ڈاکٹر۔ ڈاکٹروں کی بھلی کہی + اگر دانت میں سے
ذرا سا خون نکل آئے۔ تو وُہ اُسی کو سِل بتا دیں + تندرست سے تندرست
آدمی بھی اگر کسی ڈاکٹر کو نبض دکھلائے۔ تو وہ ضرور کوئی نہ کوئی مرض تبلا کر
کچھ نہ کچھ نسخہ لکھ دے گا۔ اور اپنے دام کھرے کرے گا + اُن مردوں کو
خدا نے وہمی پیدا کیا ہے + تمہارے مزاج میں آج کل صرف گرمی کا
غلبہ معلوم ہوتا ہے + کاسنی یا کوئی شربت بارد دو چار روز پیو۔ سب شکایت
رفع ہو جائے گی +

صفدر۔ نہیں ابّا جان مجھے گرمی ورمی کچھ نہیں۔ مجھے دراصل تپ دق
ہی معلوم ہوتا ہے +

باپ۔ پھر وُہی۔ اپنی ایک بات۔ اے تپ دِق ہے تو وہ کیا منع کرتا ہے۔
کہ شادی نہ کر۔ یا دُنیا کے دھندے چھوڑ دے + گیند بلّا کھیلنے وقت تو
تمہارا تپ دق بھی دق ہو جاتا ہے۔ اور شادی کرتے وقت اس کا بیہودہ
عُذر گھڑا جاتا ہے +

صفدر۔ ابّا جان جس پر گزرتی ہے۔ وُہی جانے + آپ کو میرا حال کیا
معلوم ہے؟ جس طرح کھیلتا ہُوں میرا دل جانتا ہے +

باپ۔ مَیں نے اب تمہیں مرض کی تشخیص کو نہیں بُلایا۔ نہ مَیں ...
فضول باتیں سُننا چاہتا ہُوں۔ مَیں جو بات پُوچھتا ہُوں۔ اُس ...

صفدر۔ پھر اس کا جواب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں

باپ۔ مَیں اس گول تقریر کو کچھ نہیں سمجھتا + مجھے صاف صاف بتاؤ۔ کہ تم کیا چاہتے ہو؟

صفدر۔ مَیں شادی کرنی نہیں چاہتا +

اکبر حسین یہ لفظ سُن کر بہُت چونکتے ہو کر بولے ہیں یہ کیا کہا۔ شادی نہیں کرنا چاہتا؟ اب نہیں کرنی چاہتے۔ یا ساری عمر ہی نہیں کرنا چاہتے؟

صفدر۔ ساری عمر ہی کیا ہے؟ میں بہت زندہ رہا۔ تو شاید بمشکل سے دو تین برس گُزاروں گا + بس میری زندگی کیا اور عمر کیا؟ اور اس میں شادی کیا کروں گا؟

باپ۔ تو مجھے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خیر سے تمہیں علم غیب بھی حاصل ہو گیا ہے + تم خُدا کے ہاں جا کر دیکھ آئے ہو گے۔ کہ دو برس میں مر جاؤ گے +

صفدر۔ جناب خدا کو کسی نے نہیں دیکھا۔ لیکن عقل سے تو پہچانا ہے۔ میرا مرض ہی ایسا ہے۔ جس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں +

باپ۔ بس بکو مت۔ بیوقوف کہیں کا + بے ادب۔ گُستاخ۔ ابے مردُود ماں باپ کی تجویزیں اس طرح گُستاخی سے رد کیا کرتے ہیں؟

صفدر۔ ابا جان آپ ناراض کیوں ہوتے ہیں۔ مَیں تو آپ کا ادنےٰ غلام ہوں + خدا نہ کرے۔ کہ مَیں آپ کے حضور میں گُستاخی کا خیال تک لاؤں + لیکن جب میری صحت کی یہ خطرناک حالت ہو۔ تو مَیں اتنا نہ سمجھوں کس طرح لے لوں؟

اُٹھانا ہوگا + اگر تم کو منظور نہ تھا۔ تو تم نے پہلے ہی کیوں نہ

اِنکار کر دیا ؛

صفدر۔ گُستاخی معاف مَیں نے اقرار کس روز کیا تھا؟ میرے تو فرشتوں کو بھی یہ یاد نہیں۔ کہ کب میری منگنی ہوئی۔ اور کب یہ صلاح مشورے ہوئے ؛ کب مجُھ سے پوچھا گیا؟ اگر مجُھ سے پُوچھا جاتا۔ تو البتہ مَیں منع کرتا بھی ؛

اکبر حسین بیٹے کی ایسی اُکھڑی اُکھڑی باتیں سُن کر ڈر گیا۔ اور پھر کہنے لگا۔ کہ دیکھو بیٹا ہم نے جو کچھ کیا ہے۔ تمہاری ہی خوشی اور آرام کے واسطے کیا ہے ؛ برخوردار تم ابھی بچّے ہو۔ تم ان باتوں کو کچھ نہیں سمجھتے ؛ جن باتوں کو ہم سوچتے ہیں۔ وہاں تک تمہارا وہم و خیال بھی نہیں جاتا ؛ صفیہ ایسی لائق لڑکی اگر چراغ لے کر بھی ڈھونڈو گے۔ تو نہ ملے گی ؛ موقع جاتا رہیگا۔ تو پھر پچتاؤ گے۔ اور افسوس کرو گے ؛

صفدر۔ ابّا جان۔ بے شک مَیں آپ کے نزدیک بچّہ ہوں۔ لیکن عُمر کے لحاظ سے تو بچّہ نہیں ہوں ؛ مجھے خدا نے اپنا نیک و بد سمجھنے کی عقل بھی دی ہے پس مَیں اپنی بھلائی بُرائی کو بخوبی سوچ سکتا ہوں ؛

باپ۔ اچھا اگر اس وقت تم کچھ جواب نہیں دینا چاہتے۔ تو خیر تم اچھی طرح سوچ سمجھ کر ہمیں پھر جواب دینا ؛

صفدر باپ کو سلام کر کے اُن سے پیچھا چھُڑا واپس آیا۔ اور چند روز تک گھر میں اس بات کا ذکر مذکور نہ ہُوا ؛

صفیہ کے باپ کو جب خط بھیجے بہت روز ہو گئے۔ تو اُس نے ایک

اَور خط بھیجا۔ لیکن اس کا بھی کوئی جواب نہ آیا + تب اُس نے ایک خط رجسٹری کراکر بھائی کے نام بھیجا۔ اور بہت کچھ اُونچ نیچ کی باتیں لکھیں۔ جب یہ رجسٹری خط اکبر حسین کو پہنچا۔ تو اس نے اور صفدر کی ماں نے پھر صفدر کو بُلاکر اُس سے اس معاملہ میں گفتگو کی + لیکن صفدر نے اس دفعہ اَور بھی زیادہ بے شرم بن کر صاف انکار کردیا۔ اور ماں باپ کی ایک نہ سُنی + ناچار اکبر حسین کو انکار کے سوا اَور کچھ نہ بن پڑا۔ اور نہایت مایُوسی سے اپنے بھائی کو یُوں خط لکھا :-

برادر عزیزِ من۔ بعد دُعا کے واضح ہو کہ تمہارے کئی خط پہنچے۔ جن کو پڑھ کر دل بہت خوش ہُوا + افسوس ہے کہ مَیں اُن کا جواب اب تک نہیں لکھ سکا۔ اور اب لکھتا بھی ہوں۔ تو وہ کوئی خوشی کا جواب نہیں ہے۔ مگر اُمید ہے۔ کہ تم جُملہ حالات پر غور کرکے اس باب میں مجھے معذور سمجھوگے + تُم نے جو کچھ تحریر کیا تھا وہ میری عَین خوشی کی بات تھی۔ لیکن بھائی مَیں کیا کروں۔ آج کل کا زمانہ ہی عجیب ہے۔ کہ چھوٹوں کو بڑوں کا ادب و لحاظ خاک نہیں رہا + بدنصیب صفدر شادی کرنے پر بالکل راضی نہیں ہوتا + اُس کو یہ وہم ہو رہا ہے۔ کہ مجھے تشنّج کا کوئی خطرناک عارضہ ہے۔ اور اس وجہ سے وہ کہتا ہے۔ کہ مَیں تمام عُمر مُجرّد ہی رہوں گا + مَیں اُسے سمجھا سمجھا کر تھک بھی گیا ہوں۔ وہ کسی طرح راہ پر نہیں آتا + ایسی حالت میں تم خیال کرسکتے ہو۔ کہ مَیں بالکل معذور

ہوں + ہاں اگر تم خود کسی طرح صفدر کو سمجھاؤ بجھاؤ - تو شاید مان جائے فقط
والدعا ؛ اکبر حسین

جب یہ خط اصغر حسین کو پہنچا - تو اس کو پڑھ کر وہ بہت ہی خوشی خوشی بیوی کے پاس آیا ؛

اصغر حسین - لو اَور سُن لو + میاں صفدر نے شادی کرنے سے انکار کر دیا ؛

بیوی - (چونک کر) سچ کہو - یہ کس نے کہا ؟

میاں - خود بھائی کا خط آیا ہے ؛

صفیہ کی ماں یہ سُن کر ہکا بکّا رہ گئی - اور بولی - کہ ایں ! اگر انکار ہی کرنا تھا - تو پہلے ہی کیوں معاملے کو بڑھایا + اب عین وقت پر یہ دغا بازی کی + تم ان کے خط کا جواب بھی لکھوگے یا نہیں ؟

میاں - جواب نہ لکھونگا تو کیا یونہی چُپکا ہو رہونگا + میں ابھی جا کر اُس کا جواب لکھتا ہوں ؛

بیوی - دیکھو ! جب جواب لکھ لو - تو مجھ کو سُنا کر بھیجنا ؛

میاں - ہاں میں تم کو سُنا کر ہی بھیجوں گا ؛

یہ کہکر اصغر حسین اپنے دفتر میں آن بیٹھے - اور بھائی کے خط کا جواب یوں لکھ کر بیوی کے پاس لائے ؛

برادر معظم من سلامت تسلیم - خط آپ کا پہنچا - اس خط کے پڑھنے سے مجھ کو اور صفیہ کی والدہ کو جو خوشی ہوئی اُس کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں
[صف]در نے شادی سے انکار کر دیا - الحمد للہ میری بیٹی کا اور اس کا

ہنس اور کوّے والا ساتھ تھا + چونکہ وہ بھی میرا بھتیجا ہے - اور مجھے
عزیز ہے - اس واسطے مَیں اُس کے عیبوں سے نظر پوشی کر کے یہ چاہتا
تھا - کہ صفیّہ کا عقد اُسی کے ساتھ کروں + آپ خود بخوبی جانتے ہیں - کہ صفیّہ
صفدر سے کس درجے زیادہ لائق ہے + تاہم عزیزداری اور آپ کی خاطر سے
مَیں اس نالائق لڑکے کے تمام عیبوں سے اندھا بن کر اپنی جگر گوشہ کو تمام
عمر کے لئے عذاب میں گرفتار کرنا منظور کرتا تھا + ورنہ آپ خیال فرما سکتے
ہیں - کہ صفیّہ کے واسطے بر کی کمی نہیں تھی + نواب صاحب کو آپ اچھی
طرح جانتے ہیں - اُن کے ہاں کی بیگمات ہزاروں منّتیں اور خوشامدیں
کرتی رہیں - کہ صفیہ ہمارے لڑکے کو دے دو - لیکن ہم نے صاف انکار
ہی انکار رکھا - حالانکہ ذات صفات - حسب و نسب کے علاوہ لڑکا خود
اپنی ذات سے نہایت لائق اور ہونہار تھا + ولایت سے بیرسٹر بن کر
آیا - پر باوجود ان اوصاف اور خوبیوں کے مَیں نے صفدر نالائق ہی کو
جسے مَیں پہلے منظور کر چکا تھا - نواب صاحب کے لائق بیٹے پر ترجیح
دی + بھائی جان یقین فرمائیے - مجھے آپ کے اِنکار کا ذرا بھی
رنج نہیں ؎

آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجے جاتا ہو تو اُس کا غم نہ کیجے

مَیں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں - کہ آپ نے صفدر کی نارضامندی سے
آگاہ فرما کر دھوکے سے نکالا + اگر مَیں دھوکے میں رہ کر صفیّہ کا عقد
با - اور بعد میں صفدر اس مسکین کے ساتھ نالائق سلوک کرتا - تو

مَیں کیا کرتا؟ میری پیاری صفیہ مجھے کیا کہتی۔ اور اس پر اور اُس کی وجہ سے ہم پر کیا گزُرتی؟

رہا صفدر کو سمجھانا سو بیرادرِ معظّم۔ اگر جہان میں لڑکوں کا کال پڑ گیا ہو۔ اور میری بیٹی کو کوئی بدنصیب نہ ہوتا ہو۔ تو البتّہ مَیں صفدر کے آگے ہاتھ جوڑوں۔ یہ معاملہ میرے اور آپ کے درمیان میں تھا۔ سو ختم ہو گیا ٭ جس بات کو صفدر کا دل خُود قُبول نہیں کرتا۔ وہ بات زبردستی اُس کو منوانا خُود اپنے پاؤں کُلہاڑی مارنا ہے صفدر نالائق صفیّہ کی قدر کیا جانے۔ بقول شخصے ؎

قدرِ اُلّو کی اُلّو جانتا ہے ہُما کو کب چُغد پہچانتا ہے؟

بس مَیں نے بہت بھر پایا۔ اب آپ مجھے معاف فرمائیں۔ والسّلام

خاکسار اصغر حسین

اصغر حسین (خط بیوی کو سُنا کر) کیوں ٹھیک ہے۔ یا کچھ اَور لکھ دوں؟

بیوی۔ ہاں بس۔ بہت مناسب ہے ٭ چاہے یہ بھی لکھ دو۔ کہ ہمیں صفیّہ کی شادی کرنا ہی منظور نہیں ٭ کیا ہمیں خُدا نے اتنا نہیں دیا۔ کہ صفیّہ کو بٹھلا کر کھلائیں ٭ ہم شادی کرتے ہیں۔ تو صرف زمانے کے خیال سے۔ ورنہ میری صفیّہ خدا نہ کرے کسی کی محتاج تھوڑا ہی ہے ٭

میاں۔ نہیں یہ کیا لکھنا؟ یہ وہ خود ہی جانتے ہیں ٭

بیوی۔ اللہ جانتا ہے۔ کہ میرا جی تو بہُت ہی بُرا ہو رہا ہے ٭ برسوں کی جمی جمائی بات اُکھڑ گئی ٭ اب کسی اَور جگہ بات چیت ہوتے بھی بہُت

چاہئے۔ نواب صاحب کے بیٹے کا بھی بیاہ ہو گیا۔ ورنہ میں تو آنکھیں بند کر کے اُس کو دے دیتی +

میاں۔ جگہ تو بہتیری مل جائیگی۔ لیکن اگر کچھ افسوس ہے تو یہ ہے۔ کہ خانہ دامادی والی آرزو جاتی رہی + صفدر نالائق تھا۔ نکمّا تھا۔ سب کچھ تھا۔ لیکن اس کے ساتھ صفیہّ کی شادی کرتا۔ تو صفیہ ہماری آنکھوں کے سامنے تو رہتی + اب ایسا کون ہے۔ جو خانہ دامادی قبول کریگا + بھائی پنشن لے کر یہاں ہی آجاتے۔ صفدر بھی یہاں ہی رہتا۔ سب مل جُل کر رہتے۔ تو کیسا جی خوش ہوتا + افسوس بھائی نے صفدر کو کچھ تعلیم نہ دی۔ اور لاڈ پیار میں بگاڑ دیا۔ ورنہ لڑکا تو خاصہ ہونہار تھا + میں نے تو کہا بھی تھا۔ کہ اگر آپ حکم دیں۔ تو مَیں اپنے خرچ سے صفدر کو ولایت بھیج دُوں۔ لیکن اُنہیں اتنی جُدائی کہاں گوارا تھی؟ اِسی مارے عُذر پیش کرنے شروع کر دئے + مجھے خیال تھا۔ کہ شادی ہو جائیگی۔ تب خود کوشش کر کے اُسے پڑھا لکھا دُونگا۔ سو وہ بات ہی جاتی رہی +

بیوی۔ تو آخر اب مَیں کیا کروں؟ مَیں تو جانُوں تہذیب نسواں میں اشتہار چھپوا دوں۔ کوئی نہ کوئی لڑکا تو مل ہی جائیگا۔ یہ اخبار عموماً بڑے بڑے معزّز گھرانوں اور تعلیم یافتہ خاندانوں میں جاتا ہے +

میاں۔ یُوں کیوں نہیں کہتیں۔ کہ کنوئیں میں دھکّا دے دو۔ کہ جلدی آنکھوں سے اوجھل ہو جائے +

بیوی۔ اے خدا سے خیر مانگو۔ تم بھی کیسی بد فال مُنہ سے نکالتے ہو +

میاں۔ تمہیں جو توائی پڑی ہے۔ جیسے وہ تمہیں کاٹے کھاتی ہے ؎

بیوی۔ اے مجھے کیا کاٹے کھاتی ہے۔ زمانہ کی طرف دیکھ کر کہتی ہوں۔ جو دیکھتا ہے یہی کہتا ہے۔ کہ جوان بیٹی بٹھا رکھی ہے ؎

میاں۔ بٹھا رکھی ہے ؎ تو کیا کسی کے سر پر بٹھا رکھی ہے؟ لوگ کہتے ہیں۔ تو بکا کریں ؎ اب ہم لوگوں کے کہے سے ڈر کر اسے کسی اندھے کنوئیں میں تھوڑا ہی دھکیل دیں گے؟

بیوی۔ تم جانو۔ پھر بھی کچھ فکر تو ضرور کرنا چاہیئے ؎

میاں۔ فکر کو مَیں کب بے فکر ہوں ؎ دیکھو آج ہی آمنہ کے باپ سے ملونگا وہ ضرور کوئی نہ کوئی معقول جگہ بتا دیں گے ؎

باب چہارم

کام رُکنے کا نہیں اے دلِ ناداں کوئی
خُود بخود غیب سے ہو جائیگا ساماں کوئی

صفیہ کا باپ اچھا تعلیم یافتہ انسان تھا۔ اور یہی باعث ہے۔ کہ صفیہ نے باپ کے علم اور ماں کے ہُنر میں سے حصّہ لے کر اپنے میں بہت سی خُوبیاں اور علمی اور عقلی لیاقت پیدا کر لی تھی ؎ پر افسوس اصغر حسین باوجود اس قدر عقلمند اور تعلیم یافتہ ہونے کے بھی بہت سی پُرانی رسمو

دلدادہ تھا + وہ صفیہ کے بیاہ کے معاملے میں صفیہ کی راے کا ذرہ برابر بھی دخل ہونا پسند نہیں کرتا تھا + اس کا یہ خیال تھا۔ کہ دولھا پسند کرنا دلھن کے ماں باپ کا کام ہے۔ نہ کہ دلھن کا + اس کی رائے میں بیٹی کا اس معاملے میں پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا کسی قسم کا اشارہ کرنا آداب خوردی اور آدابِ دختری کے سراسر خلاف ہے + جب وہ بیوی سے صفیہ کے بیاہ کے بارے میں گفتگو کر کے باہر گیا۔ تو باہر اس کا دوست ناصر مرزا بیٹھا تھا ؀

ناصر مرزا۔ السّلام علیکم ؀

اصغر حسین۔ وعلیکم السّلام + بہت دنوں کے بعد تشریف لانا ہوا۔ کہاں تھے ؟

ناصر۔ گیا تو کہیں بھی نہیں۔ آپ کی آمنہ بیمار تھی۔ اسی بکھیڑے میں پھنسا رہا + صفیہ نے جو دوا دی تھی۔ اس سے اُس کو بہت فایدہ ہوا ؀

اصغر حسین۔ شکر ہے کہ آرام تو ہو گیا + صفیہ کو آمنہ کے ساتھ بے اِنتہا اُنس ہے + وہ اپنی ماں سے کہا کرتی ہے۔ کہ امّاں آمنہ بھی تمہاری بیٹی ہوتی۔ تو کیا اچھّا ہوتا ؟

ناصر۔ وہ اب بھی آپ ہی کی بیٹی ہے۔ مَیں اسے کسی کے ہاں آنے جانے نہیں دیتا + لیکن صفیہ کے خیال سے صفیہ کے پاس جانے سے نہیں روکتا + اب ارادہ ہو رہا ہے۔ کہ آمنہ کا بیاہ کر دوں ؀

اصغر حسین۔ بھئی ہمارا ارادہ بھی صفیہ کے بیاہ کا تھا۔ لیکن کیا کہیں

ہماری تو بنی بنائی بات ہی بگڑ گئی ؛

ناصر۔ کیا ہُوا؟ خیر تو ہے؟

اصغر حسین۔ خیر کیا۔ لڑکے نے اِنکار کر دیا ؛

ناصر۔ اوہو! یہ کب اور کیوں؟

اصغر حسین۔ آج ہی تو خط آیا ہے۔ اس کی ماں کو تو بہت ہی فکر ہو رہا ہے ؛

ناصر۔ فکر کی کیا بات ہے؟ آج کہو۔ تو بیسیوں جگہ ایک سے ایک اچھّی بنا دوں؟ لیکن بھائی مجھے تو افسوس ہے۔ کہ آپ نے نواب صاحب کے لڑکے کو صفیّہ نہ دی + اگر صفیّہ وہاں جاتی۔ تو بہت ہی اچھّا ہوتا + لیکن اب بھی ایک نواب ہی سمجھو۔ اگرچہ رئیس باجتے ہیں۔ اُن کا بیٹا شادی کرنی چاہتا ہے + اگر تم حامی بھرو۔ تو مَیں وہاں بات ٹھیک ٹھاک کر دوں ؛

اصغر حسین۔ ان نواب صاحب کا تو اب ذکر ہی نہ کرو۔ وہ جگہ تو جاتی رہی۔ اس کا ذکر اب فضول ہے۔ اَور جو جگہ تم کو معلوم ہو بتاؤ؛

ناصر۔ شاید آپ نے کرنال کے رئیس اعظم میر واحد علی صاحب کا نام سُنا ہوگا؟ اُن کے صاحبزادے حامد علی نہایت لائق اور خلیق اور خُوبصورت اور ہونہار جوان ہیں + ان کے پاس مال و دولت کا تو ذکر ہے ہی نہیں۔ مگر لڑکا بھی نہایت سعادت مند اور جوان ص
شرمِ حضور ہے۔ پچھلے سال اس نے ڈاکٹری کا امتـ

اب وہ ڈاکٹر ہے + ذات کے سید بُخاری ہیں + اگر آپ چاہیں۔ تو مَیں اُن کی تصویر بھی لاکر دکھادُوں۔ اور ایک طرح پُوچھو۔ تو آپ کے رشتہ دار بھی ہیں ÷

اصغر حسین۔ ہاں ہاں بھئی خُوب یاد دلایا۔ تو کیا اُس کی اب تک شادی نہیں ہوئی؟

ناصر۔ ایسی جلدی؟ اُس کی عُمر ہی کیا ہے؟ پچھلے سال ہی تو بیچارہ طالب علمی سے چھُوٹا ہے + لیکن یہ بات ہے۔ کہ وہ گھر داماد نہیں رہینگے ÷

اصغر حسین۔ ہاں یہ تو ظاہر ہی ہے۔ گھر داماد کون رہتا ہے؟ خیر گھر داماد نہ رہیں۔ صفیہؔ تو خوش رہے + ہمیں تو زیادہ اس کی خوشی کا خیال ہے + نہایت مسکین بے زبان بچّی ہے ÷

ناصر۔ اس بات کا ضامن تو مَیں ہوتا ہوں۔ کہ صفیہؔ اس خاندان میں نہایت ہی آرام سے رہے گی ÷

اصغر حسین۔ تو اچھا پھر آپ کوشش کیجئے۔ لیکن مَیں ذرا اس کی والدہ سے بھی صلاح مشورہ لے لوں ÷

ناصر۔ ہاں ایسی جلدی ہی کیا ہے + اچھّی طرح سوچ سمجھ لو + ایسے موقعوں میں بلا سوچے سمجھے قدم رکھنا مناسب نہیں۔ بلکہ اگر میری مانو۔ تو خود ... سے بھی کسی ذریعہ سے پُوچھ لو ÷

...۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃ۔ آپ بھی کیسی بیہودہ باتیں کرتے ہیں ... میں کچھ تامّل ہوگا؟

ناصر- اور اگر ہو- تو تمہیں کیا خبر؟
اصغر حسین- ایسی باتوں کے پیار میں نہیں جانتا+ ایسے معاملوں میں لڑکیوں کے بولنے کا کیا کام؟ کیا وہ ہم سے زیادہ سمجھدار ہے؟
ناصر- سمجھدار تو نہیں- لیکن پھر بھی گزران تو اُسی کو کرنا ہے +
اصغر حسین- نہیں صاحب- یہ بے شرم بیہودگی مجھ سے ممکن نہیں- کہ میں بیٹی کے عقد میں بیٹی سے ہی رائے لوں+ اس سے بڑھ کر کوئی نامعقول حرکت ہو سکتی ہے؟
ناصر- آپ کی مرضی نہیں تو نہ کیجئے- مگر للہ ایسے نامناسب الفاظ زبان سے نہ نکالئے- جناب رسولِ خدا کا فرمودہ ہے- اور ازواجِ مطہرات کا اسی طریق پر عملدر آمد رہا ہے+ خدا کے غضب سے ڈرو- پیغمبر کی سُنّت کو نامعقول حرکت نہ کہو+ اِن الفاظ سے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں- خُدا جانے تم اَور کیا کیا کہو گے- اس لئے جواب سُنے بغیر رُخصت ہوتا ہوں +

ناصر مرزا تو رُخصت ہُوا- اور اصغر حسین زنان خانے میں داخل ہُوئے- دیکھا کہ بیوی کچھ اُداس سی ہیں +
اصغر حسین- کیوں خیر ہے؟ آج اُداس سی بیٹھی ہو؟
بیوی- کچھ نہیں اچھی ہوں +
میاں- کچھ سبب تو ضرور ہو گا +
بیوی- کچھ نہیں- مجھے تو لڑکی کے فکر نے حیران کر رکھا ہے +

میاں۔ مجھے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تمہارا یہ فکر مجھے گھبرا کر کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع نہ دے گا۔ بلکہ آنکھیں بند کر کے صفیہؔ کو کنویں میں ڈلوائیگا ۔

بیوی۔ کوئی کام ہو۔ پھر بغیر فکر کے تو ہو نہیں سکتا ۔

میاں۔ اجی تمہارا فکر فضول ہے۔ ہماری صفیہؔ کو بروں کی کمی ہے۔ لو میں ابھی اس کے واسطے ایک جگہ تلاش کر آیا ہوں ۔

بیوی۔ وہ کون سی؟

میاں۔ نواب واحد علی صاحب کے لڑکے حامد علی شادی کرنی چاہتے ہیں۔ میری عقل میں ان سے بڑھ کر صفیہؔ کے واسطے اور اچھا بر کوئی نہیں ہوگا۔

بیوی۔ حامد اب تک کنوارا بیٹھا ہے؟

میاں۔ ہاں علم کا بہت شوق تھا۔ اسی خیال سے اس نے جلدی شادی نہیں کی۔ اب وہ اچھا خاصہ ڈاکٹر ہے ۔

بیوی۔ اے وہ تو میرا دیکھا ہوا ہے۔ وہ تو بڑا غریب بچہ ہے وہاں میری صفیہؔ کی بات ٹھیر جائے۔ تو پھر کیا کہنے ہیں؟

میاں۔ بات ابھی ٹھیر جائیگی۔ تم سوچ سمجھ لو ۔

بیوی۔ وہ کیا غیر جگہ ہے۔ جسے سوچوں سمجھوں۔ اپنا کنبہ برادری تو ہے ہی۔ میں ان کے ہاں کے سب لوگوں کے مزاج سے واقف ہوں۔ حامد کے ابّا میری ممانی جان کے بھائی تو تھے ہی ۔ بھائی ہی تو تھے

میاں۔ تو پھر میں آج ہی حامی بھر لیتا ہوں ۔ کہ بھی

بیوی۔ اُن کا کوئی رُقعہ تمہارے پاس آیا ہے ۔

میاں۔ نہیں۔ ناصر مرزا کہتے تھے۔ کہ وہ رشتے کی تلاش میں ہیں +
بیوی۔ اللہ کے صدقے جاؤں۔ اُس نے میری صفیہ کے واسطے بیٹھے بٹھائے اچھے سے اچھا گھر بتا دیا + میری صفیہ بڑے نصیبے والی +
اصغر حسین بیوی کے پاس سے اُٹھ کر باہر گئے۔ تو اُنہوں نے فوراً ناصر مرزا صاحب کو بُلایا۔ اور کہا کہ لو بھائی صفیہ کی ماں تو راضی ہیں۔ تم آج ہی اُن کو خط لکھ دو +
ناصر مرزا۔ بہت بہتر لائیے کاغذ قلم دوات۔ میں یہیں بیٹھے بیٹھے سب کچھ لکھے دیتا ہوں +
چنانچہ ناصر نے دوات قلم کاغذ لے کر صفیہ کا مفصل حال خط میں لکھ دیا + اصغر حسین نے کہا۔ کہ بھائی یہ خط مجھے دو۔ تو میں صفیہ کی ماں کو سُنا آؤں +
ناصر۔ بہت بہتر لے جائیے +
اصغر حسین خط لے کر زنان خانے میں گئے۔ اور کہا لو بیگم میں خط لکھوا لایا ہوں۔ سُن لو +
مکرم و معظم بندہ جناب نواب صاحب۔ پس از آداب کے عرض ہے۔ کہ والانامہ شرفِ صدور لایا تھا۔ میں یاد آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں + حسب الارشاد جناب والا چند گھروں کی لڑکیوں کا حال دریافت کیا + ان میں دو لڑکیاں تو معمولی نوشت و خواند جانتی ہیں متوسط درجے کے گھروں کی بیٹیاں ہیں۔ صورت شکل میں خاصی ہیں نجیب الطرفین بھی

ہیں۔ مگر آنجناب کے گھر کے لائق سیّد اصغر حسین صاحب کی صاحبزادی ہیں۔ میر صاحب کو تو آنجناب اچھّی طرح جانتے ہونگے۔ اس لڑکی کی تعریف کو کافی الفاظ نہیں۔ حُسن صورت۔ حسن سیرت۔ فہم و فراست غرض ہر بات میں دسوں اُنگلیاں دسوں چراغ۔ انٹرنس تک کی تعلیم ہے۔ پچھلے سال تہذیب نسواں میں اُن کے قلم کے لکھے ہُوئے ایسے بے نظیر مضامین نکلے تھے۔ کہ اچھے اچھے تعلیم یافتہ مرد اُن مضامین کو پڑھتے اور عش عش کرتے تھے۔

علاوہ ازیں وہ ڈاکٹری بھی جانتی ہیں۔ مصوّری بھی سیکھی ہے۔ مختصر یہ ہے۔ کہ اگر ایسی لڑکی آپ چراغ لے کر بھی ڈھونڈیں گے۔ تو بھی نہ پائیں گے۔ وہ روپیہ پیسہ کچھ نہیں چاہتے۔ وہ چاہتے ہیں۔ کہ ہڈی میں ہڈی اور پیوند مل جائے۔ پس اگر آپ چاہیں۔ تو بواپسی ڈاک جواب دیں۔ تاکہ میں آپ کے واسطے اس باب میں کوشش کروں۔ بلکہ مناسب ہے۔ کہ آپ خود بھی میر صاحب کو اس بارے میں تحریر کریں۔ مجھے یہ بھی بخوبی معلوم ہوا ہے۔ کہ لڑکی کا سابقہ رشتہ چھوٹ گیا ہے۔ اور اس باب میں اُن سے خط و کتابت کرنا کسی طرح قابلِ اعتراض نہ ہوگا۔

والسّلام۔ خاکسار ناصر مرزا

ایسی من مانی مُراد کے خطوں میں کیوں دیر لگنی تھی۔ تیسرے روز ہی ناصر مرزا اس خط کا جواب لئے صفیہ کے باپ کے پاس آئے۔ اور کہا لیجئے۔ حضور مبارک ہو۔ حامد علی صاحب کا خط آگیا۔ اُنہوں نے میرا

تجویز کو نہایت دلی خوشی اور شکرگزاری کے ساتھ منظور کیا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ غنیمت سمجھا ہے۔ وہ اس باب میں بہت جلد آپ کو خط لکھنے والے ہیں۔ بس اب جائیے۔ اور گھر میں خوشی کی خبر سنائیے۔

اصغرحسین خوشی خوشی گھر میں آئے۔ اور رشتے کی منظوری کی خبر سنائی۔ اور بیوی سے کہا۔ کہ میرے خیال میں عید کا چاند اس کارِخیر کے واسطے مناسب ہوگا۔ اور جلدی میں اس واسطے چاہتا ہوں۔ کہ ایسے میں صفدر نے انکار کر دیا ہے۔ میں اس کام سے فراغت حاصل کر لوں۔ ایسا نہ ہو۔ بھائی صفدر کو سکھا بُجھا کر راضی کر لیں۔ اور پھر پاؤں پسار دیں۔ اس عُمدہ موقع کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہئیے۔

بیوی۔ کہتے تو سچ ہو۔ بس جلدی خط بھجوا دو۔

میاں۔ ابھی میں حامد کے خط کا منتظر ہوں۔ دیکھوں وہ کیا لکھتے ہیں؟

بیوی۔ اچھّا انتظار کر لو۔

دوسرے روز علی الصّباح صفیہ کا باپ حسبِ معمول چاء پی رہا تھا۔ کہ چٹھی رساں نے آواز دی۔ "خط لے جاؤ"۔

اصغرحسین۔ امامن (ماما) جانا باہر سے خط لے آنا۔

امامن باہر گئی۔ اور ایک رجسٹری خط لا کر اصغرحسین کے ہاتھ میں دیا۔ اور کہا کہ میاں رسید مانگی ہے۔

اصغرحسین نے رسید دستخط کر کے امامن کو دی۔ اور خود خط کھولا۔ تو اس میں سے ایک بند لفافہ اور ایک خط تہی کیا ہُوا نکلا۔ اصغرحسین

نے لفافہ کو کھولا۔ تو اس میں سے ایک نہایت وضعدار تصویر نکلی + تصویر کے اوپر انگریزی حروف میں لکھا ہُوا تھا۔ سید حامد علی

اصغر حسین نے تصویر کو دیکھ کر رکھ دیا۔ اور خط پڑھنے لگے۔ کہ اسنتے ہی میں بیوی بھی آن موجود ہُوئیں ❊

بیوی۔ حامد علی کا خط بھی آیا یا نہیں؟

میاں۔ حامد کا خط تو نہیں آیا۔ میرے ایک دوست کی تصویر آئی ہے لو پہچانو تو۔ یہ کس کی تصویر ہے؟

بیوی (تصویر دیکھ کر) کچھ دل ہی دل میں صُورت پھرتی ہے۔ نام تو یاد نہیں آتا۔ میری صفیہؔ ہو۔ تو ابھی پہچان لے ❊

میاں (ہنس کر) چاہے اس نے کبھی پہلے دیکھی ہو یا نہ دیکھی ہو۔ پہچان ضرور لے؟

بیوی۔ تصویروں کی شناخت اُسی کو آتی ہے ❊

میاں۔ تم تو احمق ہو۔ دیکھی ہُوئی تصویر کو سب ہی پہچان سکتے ہیں۔ اور جو دیکھی ہوئی تصویر نہ ہو اُسے کوئی کس طرح پہچانے؟ آنکھوں پر عینک لگاؤ۔ تو اچھی طرح نظر آئے جس کی تصویر ہے وہ تمہارا دیکھا ہُوا ہے ❊

بیوی (جل کر) جانے میری بلا۔ نگوڑا کون فرنگی سا بیٹھا ہے؟

میاں (ہنس کر) حامد علی ہے ❊

بیوی۔ اُوئی۔ نوج حامد علی ایسا ہو ❊

میاں۔ کیا تم نے اب بھی نہیں پہچانا؟

بیوی۔ صورت تو حامد علی سے ہی کچھ ملتی جُلتی ہے لیکن وضع میں توزمین آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔ مَیں نے جب اُسے دیکھا تھا۔ نو برس کی عُمر تھی۔ چوگوشیہ ٹوپی اوڑھے ہُوئے تھا۔ گلے میں اچکن تھی چُست پاجامہ سلیم شاہی جُوتی پہنے تھا ۔

میاں۔ جب جاہل تھا۔ اب عالم ہے۔ جنٹلمین ہے ۔

بیوی۔ مجھے تو یہ وضع قطع ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اس سے تو میرا صفدر ہی بھلا ہے۔ کہ آدمیوں کی سی وضع تو ہے ۔

میاں۔ کیا یہ آدمیوں کی وضع نہیں؟

بیوی۔ ہمارے مُلک کے آدمیوں کی وضع تو ہے نہیں ۔

میاں۔ وضع قطع پر پھر بحث کر لینا۔ اچھا خط تو سُن لو ۔

بیوی۔ سُناؤ ۔

میاں نے اس طرح خط سُنانا شروع کیا ۔

ہرچہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

جناب عموی صاحب تسلیم ۔ اگر آپ اپنے خیالات مُبارک کو دس برس پرے ہٹا کر لے جائیں۔ تو مَیں آپ کو فوراً ہی یاد آجاؤنگا۔ کہ مَیں آپ کا وُہی خاکسار حامد ہوں۔ جسے آپ نہایت شفقت سے اپنے پاس بٹھاتے اور گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھے ۔ مجھے افسوس ہے۔ کہ اس قدر عرصہ سے خاکسار کو آپ کی خدمت میں نیاز حاصل کرنے کا کبھی اتفاق نہ ہُوا ۔ انقلاب زمانہ نے چند در چند مکروہات میں ایسا گرفتار رکھا۔ کہ حق تو یہ ہے۔ کہ

اپنے آپ کو بھی بھولا رہا + مگر آنجناب کی یاد ہمیشہ میرے دل میں رہی۔ اور اب تک موجود ہے۔ اور خُدا سے دُعا ہے۔ کہ خدا اس محبّت کو اَور زیادہ پُختہ کرے۔ آمین ÷

مجھے اگرچہ اپنا اصلی مُدعا ظاہر کرتے شرم آتی ہے۔ لیکن افسوس کہ میرے سوا اس وقت میرا اَور کوئی ایسا ہمدرد بھی موجود نہیں۔ جو میری عرض آپ کی خدمت میں پیش کرے ÷

مَیں جب لنڈن میں تھا۔ تو جناب قبلہ و کعبہ کا ایک خط مجھے پہنچا تھا۔ جو اتفاق سے بعد تلاش دیگر خطوط میں سے مجھے مِل گیا ہے۔ بجنسہٖ اس کی نقل ارسال خدمت کرتا ہوں۔ وہو ہذا

برخوردارِ من۔ بعد دُعا مزید حیات کے واضح ہو۔ کہ میری صحت بہت خراب حالت میں ہے + مجھے اب یہ اندیشہ بھی ہو رہا ہے۔ کہ ایسا نہ ہو۔ تمہارے ہندوستان میں واپس آنے سے پہلے ہی مَیں اس دار ناپائدار سے چل بسوں + تم اِمتحان سے فارغ ہو چکے ہو۔ تو اپنی روانگی میں بہت جلدی کرو + حامد خُدا کا شکر ہے۔ کہ مَیں تم کو ترقّی کی اس سیڑھی پر دیکھتا ہوں جس پر دیکھنے کی مجھے آرزُو تھی + مجھے ارمان تھا۔ کہ مَیں تمہارا بیاہ بھی دیکھ لُوں۔ مگر افسوس کہ باوجود ہر طرح کی چھان بین کے مجھے کوئی لڑکی ایسی نہ ملی۔ جسے مَیں تمہارے لئے منتخب کرتا + یہ کام عرصے کا ہے۔ تمہاری والدہ نے قبل انتقال مجھے کہا تھا۔ کہ اگرچہ میر اصغر حسین صاحب کی دُختر صفیہ سے منگنی ہو چکی ہے۔ لیکن اگر انقلاب زمانہ اس منگنی کی قید کو دور کر دے۔

تو حامد کا بیاہ صفیہؔ سے کرنا۔ سو بیٹا یہ اُن کا پیغام تھا۔ جو مَیں نے آج تم کو پُہنچا دیا ہے۔ اور صرف اس خیال سے احتیاطاً لکھا ہے۔ کہ مُبادا تمہاری واپسی تک مَیں نہ ہوں۔ اور یہ پیغام میرے سینے میں میرے ساتھ ہی دفن ہو جائے + بیٹا صفیہؔ واقعی نہایت لائق لڑکی ہے۔ تم میرے جیتے جی آ گئے۔ تو مَیں اب بھی کوشش کروں گا۔ کہ میر اصغر حسین صاحب تمہیں اپنی فرزندی میں لیں + اگر میری یہ آرزو پُوری ہو جائے۔ تو مَیں اپنے تئیں بڑا خوش قسمت سمجھُوں۔ والدّعا

یہ چند سطور جناب قبلہ کے خط کی نقل ہیں + افسوس اس وقت اُن کا سایہ میرے سر پر نہیں ہے۔ ورنہ یہ خط آج مَیں خُود کیوں لکھتا؟ اُن کی یاد اس وقت مجھے آٹھ آٹھ آنسو رُلا رہی ہے +

لوگوں کا قاعدہ ہے۔ کہ اس قسم کے معاملات براہِ راست طے نہیں کرتے بلکہ دُوسرے لوگوں کی معرفت طے کرواتے ہیں۔ لیکن مَیں اس قاعدے کو پسند نہیں کرتا + اس خیال سے یہ عریضہ خدمت شریف میں اپنے ہاتھ ہی سے لکھ کر پیش کرتا ہُوں + مجھے اُمید ہے۔ کہ آپ کو اس خاکسار کی نسبت کُچھ چھان بین کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ کیونکہ خاکسار کے جُملہ حالات بچپن سے لے کر آج تک آنجناب پر روشن ہیں + اگر مَیں ایسا خوش نصیب ہوں۔ کہ آپ مجھے اپنی غلامی میں قبُول فرما سکیں۔ تو اس سے بڑھ کر میرے لئے اَور کوئی بات فخر و عزّت کی نہیں ہو سکتی +

اخیر میں یہ ادب التماس ہے۔ کہ اگر کوئی کلمہ خلاف ادب میری قلم سے

سہواً نکل گیا ہو۔ تو آپ ایسے معاملوں میں خاکسار کو ناتجربہ کار سمجھ کر بزرگانہ کرم سے معاف فرماویں۔ فقط ٭

میری طرف سے بخدمت اقدس جناب چچی صاحبہ قبلہ دست بستہ آداب۔ زیادہ حد ادب ٭

راقم خاکسار حامد علی سول سرجن میڈیکل ہال آگرہ

اصغر حسین (بیوی سے) لو اب کہو۔ کہ کیا رائے ہے ٭ اور میں کیا جواب دوں؟

بیوی (سوچ کر) کیا بتاؤں؟

میاں۔ یہ کیا اُلٹا جواب ہے! بتانے کی کوئی بات ہی نہیں؟

بیوی۔ بات کیوں نہیں؟ پر بغیر سوچے سمجھے کیا کہہ دوں؟

میاں۔ ابھی اگلے روز تو تم حامی بھر چکی ہو۔ اور ابھی سوچنا سمجھنا باقی ہے؟

بیوی۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ حامد کی وضع قطع کھٹکتی ہے ٭

میاں۔ کیوں؟ وضع قطع میں کیا خرابی ہے؟

بیوی (کچھ ہارے جی سے) خیر تو اب کرنا تو ہے ہی۔ اس سے اچھی شاید اَور جگہ ملے بھی نہیں۔ سو تم تاریخ مقرر کر دو ٭

میاں۔ تمہاری اس وقت کی باتوں سے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ تم تصویر کو دیکھ کر آزردہ ہو گئی ہو ٭ نہیں تم کو ایسا خیال نہیں کرنا چاہئے۔ کہ وضع قطع بدلنے سے انسان کا مذہب جاتا رہتا ہے ٭ تم خاطر جمع رکھو۔ حامد علی

اس قسم کا انسان نہیں ہے۔ اب تم دلجمعی سے مجھے یہ بتا دو۔ کہ تاریخ کون سی مقرر کروں؟ اور کن کن صاحبوں کو بُلاوے کے خطوط بھیجوں؟ اور ہاں بھائی کو بھی بُلالوں یا نہیں؟

بیوی (کچھ خوش ہوکر) عید کی تاریخ مقرر کرلو۔ اور بھائی اور بھابی کو بھی بُلاؤ۔ انکار کیا ہے۔ تو انہوں نے کیا ہے۔ شرمندہ ہوں گے۔ تو نہ آویں گے۔ ہم تو اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں گے۔

اصغرحسین۔ تو میں باہر جاکر سب خطوط لکھے دیتا ہوں۔ ہاں صفیہ کے واسطے از قسم جہیز کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟

بیوی۔ صفیہ کے لئے ایک رومال تک کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا کل سامان تیار ہے۔ البتہ بیاہ کے دنوں کے واسطے رسد خریدنی ہوگی۔ سو اِس کا اِنتظام کرلو۔

میاں۔ اِس بارے میں ناصر مرزا کو کہوں گا۔ وہ سب کچھ کر لیں گے۔

یہ کہ کر اصغرحسین باہر چلے گئے۔ اور بیاہ شادی کے بُلاووں کے خط پتّر لکھنے میں مشغول ہوئے۔

باب پنجم

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

آمنہ۔ بُوا صفیہ ایک بات کہوں۔ تم خفا تو نہ ہو گی؟
صفیہ۔ پہلے کس روز میں تم پر خفا ہوئی ہوں؟
آمنہ۔ بھئی ہم نے تو ایک خوش خبری سُنی ہے۔
صفیہ۔ وہ کون سی؟
آمنہ۔ اب تمہارا بیاہ ہوگا۔
صفیہ۔ بڑی اچھی بات ہو گی۔ اُس کی خوشی تو کچھ تمہیں ہی ہو گی۔
آمنہ۔ کیوں تمہیں نہ ہو گی؟
صفیہ (ٹھنڈی سانس لے کر) آمنہ کچھ نہ پوچھو۔ جو میرے دل پر گزرتی ہے۔ بس میرا ہی جی جانتا ہے۔
آمنہ۔ وہ کیا تمہارے دل پر گزرتی ہے؟
صفیہ۔ بھئی آمنہ میں تو سچی کہوں۔ مجھے تو صفدر حسین ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ کچھ ابّا جان اور اماں جان ہی کو اُن میں خوبی نظر آتی ہو گی۔ مجھے تو وہ ڈھنگ سر کا آدمی ہی نہیں معلوم ہوتا۔

آمنہ۔کیوں اس میں کیا عیب ہے؟
صفیہ۔سب سے بڑا عیب تو یہی ہے۔کہ اُسے دق کا عارضہ ہے +
آمنہ۔دق کا عارضہ ہے تو کیا ہُوا۔کیا اس کا علاج نہیں ہو سکتا ؟
صفیہ۔تمہیں اتنی بھی خبر نہیں + تپ دق کی بیماری کا بھی دُنیا میں کوئی علاج ہے + اس بیماری سے کوئی شخص بچ نہیں سکتا ہے + میرے ابّا جان تو یُوں ہی ناداں بنے ہُوئے ہیں۔اس سے تو میرا گلا گھونٹ دیں۔تو اچھّا ہے + تم مجھے خوش دیکھتی ہو تو خیال کرتی ہو گی۔کہ مجھے اپنے معاملے کا کچھ فکر یا اندیشہ نہیں۔کیا کروں۔دل ایسی چیز نہیں۔جسے چیر کر مَیں تمہیں دکھا سکوں۔ورنہ تم دیکھ کر حیران ہو۔کہ اس فکر نے میرے دل کا کیا حال کر رکھا ہے + بُوا دُنیا کی جو اصل بہار ہے۔وہ بیاہ کے بعد شوہر کے دم کے ساتھ ہوتی ہے۔لیکن وہ بہار بھی کسی نصیبے والی کو دیکھنی نصیب ہوتی ہے + مجھے ہر حال میں خدا کا شُکر کرنا چاہئے + پھر بھی مَیں کہتی ہوں۔کہ مَیں اس معاملۂ شادی میں ضرور بد نصیب ثابت ہوں گی۔کیونکہ مَیں نے اپنی پہلی عمر میں بہت سُکھ دیکھ لئے ہیں + جو آدمی اپنی پہلی عمر سُکھ سے گزارتا ہے۔وہ عموماً پچھلی عمر میں تکلیف پاتا ہے + آمنہ! مجھے تم سے کچھ پردہ نہیں۔مَیں اپنے دل کا حال صاف صاف تم سے کہہ رہی ہوں۔اور کہے دیتی ہوں تم مجھے کوئی ترکیب بتاؤ۔کہ مَیں اس معاملے کے رفع کرنے کو کیا کروں؟ جب نواب صاحب کے لوگ منّتیں کر کر

اُنہوں نے نہ مانا۔ تو اب اَور کسی کا کہا یہ کیا مانیں گے۔ آمنہ بہن مَیں سچ کہتی ہوں کہ کئی کئی رات مجھے اس اُلجھن میں گزر جاتی ہے۔ اور جب مجھے آپ آنے والی قسمت کا خیال آجاتا ہے۔ تو میرا یہ جی چاہتا ہے کہ مَیں کچھ کھا کر سو رہوں ❊

آمنہ۔ توبہ۔ تم تو بڑی گھبراہٹ والی ہو۔ چلو بھائی کو بیماری ہے۔ تو کیا ہُوا۔ اور اگر وہ نالائق ہیں تو کیا ہُوا؟ جب تم خود لکھی پڑھی دست و قلم ہو۔ تو لکھا پڑھا کر اُنہیں بھی عالم بنا لوگی۔ اور جب تم خود ڈاکٹر ہو۔ تو دوا دارُو سے آپ ہی اُنہیں اچھا کر لوگی ❊

صفیہ۔ مَیں اچھا کر لوں گی؟ اُن کے اچھا کرنے کو تو شاید مسیح بھی آئیں۔ تو اُمید نہیں۔ کہ وہ اچھے ہوں ❊

آمنہ۔ توبہ کرو بوا توبہ کرو۔ تم ڈاکٹر ہو کر ایسی باتیں کرتی ہو۔ کوئی مرض دُنیا میں ایسا بھی ہے۔ جس کی خدا نے دوا نہیں بنائی ؎

کہا دُکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا
کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا

صفیہ۔ پیاری آمنہ اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ ایسا کوئی مرض نہیں۔ جس کی دوا علاج نہیں۔ لیکن ایک مرض موت ہی ایسا ظالم مرض ہے جس کے آگے طبیب اور ڈاکٹر اور دوائیں سب رکھی کی رکھی رہ جاتی ... مرض کی دوا تو لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں تھی + اس پر بھی ... اس کے سب نسخے رکھے کے رکھے ہی رہے

اور وہ چل بسا۔ پس پھر میں ڈاکٹر کیا اور میری لیاقت کیا۔ اللہ ہی اپنے پردۂ غیب سے کچھ مہربانی کردے تو کردے ورنہ بندی کی کیا بساط ہے؟
آمنہ۔ برجنم تُو اچھی ہی ہو۔ ہماری آنکھوں کے آگے تو رہو گی؟
صفیہ۔ اس آگے رہنے سے تو میں دُور ہی رہتی تو ہزار درجہ بہتر تھا۔ اچھا تو بتاؤ تم نے کیا سُنا؟
آمنہ۔ عید کی چودہ تاریخ بیاہ کے واسطے مقرر ہو گئی ہے۔ اَور کیا سُنا؟
یہ سُنتے ہی صفیہ کانپ اُٹھی۔ اور اُس نے کفِ افسوس ملا۔ کہ ہائے میرے خیالی پُلاؤ یوں ہی پکتے رہے۔ میں یہ ہی سوچتی رہی۔ کہ امّاں جان کو اس رشتے کی بھلائی بُرائی جتا کر اور حقیقت حال بتا کر اُن کا دل اس رشتہ سے پھیروں گی۔ ہائے وہاں یہ ستم بھی ہو گیا۔ ہائے شرم! تیرا ستّیاناس ہو۔ تُو نے مجھے حق بات کہنے سے روکے رکھا۔ اے بے ایمان جھوٹی حیا۔ سچّوں کو بُزدل۔ ایمانداروں کو ڈرپوک بددیانت بنانے والی سچائی کو دبانے والی۔ اور جھوٹ کے آگے سرِتسلیم خم کرانے والی اگر تو اس وقت دامنگیر نہ ہوتی۔ تو میں کسی نہ کسی طرح امّاں جان پر اپنا منشاء دلی ظاہر کر دیتی۔ خدا جانے اب تیری بدولت میری بدنصیبی مجھے کیا کیا دکھائے گی؟ اب تو میرا کچھ کہنا بھی فضول ہے۔ وہ تاریخ شادی مقرر کر چکے ہیں۔ اب کیا ہے؟ اب تو یہ لکھا کسی کے مٹائے نہیں مٹتا۔ ہائے افسوس میں ہمیشہ کے واسطے تباہ کر دی گئی۔ یہ شادی خانہ آبادی نہیں۔ بلکہ صفیہ کے واسطے بربادی ہے۔ ایسے ا

خیالوں نے صفیہؔ کے دل کو گھیر لیا۔ اور وہ حیرت اور خاموشی کا پُتلا ہوگئی کہ اتنے میں آمنہ نے اس سکوت کو اس طرح توڑا +

آمنہ۔ توبہ بوا تم تو ایسی گھبراگئیں۔ کہ ابھی ذرا چھیڑوں تو رو پڑو + اچھّا لو اب ہنسی ہو چکی۔ اب سچ سچ اور اصل اصل معاملہ سُن لو +

صفیہؔ۔ اصل اصل معاملہ کیا ہے؟

آمنہ۔ تمہارے ابا جی نے تمہارے بڑے ابّا کو شادی کے واسطے خط لکھا تھا + وہاں سے جواب آیا۔ کہ صفدر حسین شادی نہیں کرنا چاہتا۔ اس لئے میری طرف سے صاف صاف انکار ہے +

صفیہ۔ جھُوٹ بھی بولتی ہو۔ تو پیٹ بھر کر بھئی جو بات کہنے کی ہو سچ سچ کہا کرو۔ ہمارا دم اُلجھتا ہے +

آمنہ۔ توبہ سنو تو سہی۔ تمہیں تو سب کے کہے جھُوٹے ہی سُنائی دیتے ہیں + مَیں اپنے ابا جی کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔ کہ مَیں جو کچھ کہوں گی سچ کہوں گی + صفدر حسین نے شادی سے قطعی اِنکار کردیا ہے۔ اور سیّد حامد علی کے ساتھ تمہارا رشتہ قرار پاگیا ہے + حامد علی صاحب بھی ڈاکٹر ہیں۔ تم بھی ڈاکٹر۔ چلو خوب گزُرے گی۔ جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو + لاؤ اس بات پر مُنہ میٹھا کروا دو +

صفیہؔ یہ خبر فرحت اثر سُن کر بے انتہا خوش ہُوئی۔ اور بےساختہ اس کے مُنہ سے شکر۔ الحمدللہ نکلا + مدتوں کے بعد آج اُس کے بے قرار مضطرب دل کو پورا اطمینان ہُوا۔ اور وہ سمجھی کہ مَیں اب بلا میں سے

نکلی۔ اب اس کا تردّد رفع ہُوا۔ اور آمنہ سے ہنسی خوشی باتیں کرنے لگی۔

باب ششم

زمینِ چمن گُل کھلاتی ہے کیا کیا
خوشی کرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

رمضان شریف کی ستائیسویں تاریخ کو ہماری صفیہ زرد جوڑا پہنا کر مایوں بٹھائی گئیں۔ آج ہی کے دن صفیہ کی بڑی امّاں صاحبہ اور اکبر حسین مع صفدر حسین کے بھی آگئے۔ اور دُور و نزدیک کے مہمان بھی جمع ہونے شروع ہو گئے۔ نواب صاحب اور اُن کی بیگم کو صفیہ کے ساتھ بہت ہی محبّت تھی۔ وہ اس کو اپنی بیٹیوں کی طرح چاہتے تھے۔ گھر میں جو چیز آئے۔ اس میں صفیہ کا حصہ پہلے بھیجتے تھے۔ یہاں تک کہ عید بقر عید پر صفیہ کے واسطے عیدی بھی آتی تھی۔ اب جو اُنھوں نے سُنا کہ صفیہ کا بیاہ پھیلا ہے۔ تو اپنی طرف سے صفیہ کے واسطے جُدا جہیز تیار کیا۔ اس میں زیور کپڑوں اور برتنوں کے سوا بٹوے۔ مُوباف اور چھوٹی چھوٹی چیزوں تک جو مائیں بیٹیوں کے لئے بناتی ہیں۔ سب کچھ دیا۔ بیاہ سے چار روز پہلے نواب بیگم خود یہ جہیز لے کر صفیہ کی ماں کے پاس آئیں۔ صفیہ کی ماں اور سب کُنبے برادری کی بیبیاں اس پُر تکلف جہیز

دنگ رہ گئیں+ صفیہ کی ماں نے ہر چند چاہا کہ نواب بیگم کے احسان کا اس قدر بوجھ نہ اُٹھائیں۔ لیکن نواب بیگم نے ایک نہ مانی+ جب گھر واپس جانے لگیں۔ تو صفیہ کی ماں کو کہ گئیں۔ کہ دیکھو بہن! میں کہے دیتی ہوں۔ برات کا ایک وقت کا کھانا اگر تُم دو گی۔ تو دوسرے وقت کا میں دُوں گی+ اللہ میری صفیہ کا نیک نصیبہ کرے۔ خدا کرے کہ صفیہ بیل ہو کر پھیلے اور پھُولوں کی طرح کھلے+ اس بچّی کے لئے میرے رُوئیں رُوئیں سے دُعائیں نکلتی ہیں+ اب اللہ نے خیر رکھی تو میں صفیہ کی برات کے دن آؤں گی۔ لو اللہ بیلی+ یہ کہ کر نواب بیگم سوار ہو گئیں۔ کنبے والیوں کو دیکھ کر اچنبھا ہُوا۔ کہ نواب بیگم ان لوگوں سے ایسی محبّت رکھتی ہیں+

صفیہ کی چچی امّاں یعنی صفدر کی امّاں کا تو کچھ نہ پوچھو۔ کہ ان سب ٹھاٹھوں کو دیکھ کر کس قدر غمگین ہوتی اور ٹھنڈی سانسیں بھرتی تھی+ بار بار میاں سے کہتی تھی۔ کہ ہائے صفدر نے سونے کی چڑیا اُڑا دی+ صفیہ جیسی لائق اور صفیہ جیسی صاحب دولت بہُو اب کہاں ملیگی؟ آخر صفدر کا باپ بولا۔ کہ اُڑانے کے کیا معنے؟ لڑکی کا نکاح تھوڑا ہی ہُوا ہے+ اگر صفدر نالائق حامی بھرتا۔ تو آج اس کا عقد ہو گیا ہوتا؟

بیوی۔ کل برات آنے والی ہے۔ ابھی اُڑانے میں تمہیں شک ہی باقی ہے؟

میاں۔ برات آنے والی ہے۔ تو ہمارا کیا بگڑتا ہے؟ زیادہ حق ہمارا اُن لوگوں کا؟

بیوی۔ حق تو ہمارا ہی تھا لیکن اپنے ہاتھوں اپنے پاؤں میں کلھاڑی مار لی تو اب کیا ہوتا ہے؟

میاں۔ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اگر صفدر راضی ہو جائے۔ تو واللہ آج ہی نکاح کرا دوں۔

بیوی۔ یہ سب تمہاری شیخ چلی کی سی باتیں ہیں۔ اب تو یہ لفظ بھی زبان پر نہیں لایا جاتا۔

میاں۔ مجال گئی ہے۔ کہ اصغر حسین میرا کہا نہ مانے۔

بیوی۔ کیا تمہیں یہ یقین ہے۔ کہ اگر تم اب بھی اس معاملے میں کچھ کہو گے۔ تو بھائی تمہارا کہا مان لیں گے؟

میاں۔ یقین؟ پختہ یقین ہے۔ اور پختہ سے بھی پختہ۔

بیوی۔ اے تو بلا سے اب بھی صفدر کو سمجھاؤ۔ شاید اُسے غیرت آ جائے۔

میاں۔ وہ مردود میرا کہا نہیں مانے گا۔ اور ناحق مجھے رسوا کرے گا۔ میں تو اس نالائق کی صورت سے بیزار ہوں۔

بیوی۔ تم سمجھاؤ تو سہی۔ یہ اَور موقع ہے۔ شاید کہا مان لے۔

میاں۔ تمہاری تو اَوندھی سمجھ ہے۔ وہ یہاں تک آنے کا تو روادار ہے ہی نہیں۔ کہنا کیا مانے گا؟ خدا جانے اس بدنصیب کو اس لڑکی سے کیا نفرت ہو گئی ہے؟

بیوی۔ نفرت تو نہیں۔ مگر بچارا اپنی جان سے تنگ ہے۔ اب بھی رات سے بخار چڑھا ہوا ہے۔ وہ دیکھو دھوپ میں رضائی لپیٹے پڑا ہے۔

میاں۔ ہاں کچھ یہ بات بھی ہے۔ کہ وہ بچارا بیمار رہتا ہے ؛ میری سمجھ میں ایک بات آتی ہے۔ کہ اس کے چند دوستوں کو اس کے پیچھے لگا دوں اور کہوں کہ اُسے خوب شرمندہ کرو کہ واہ میاں تم اچھے مرد ہو۔ جو تمہاری بیوی کو اَور شخص لئے جاتا ہے۔ اور تم کو کچھ بھی غیرت نہیں ؛ مرد ہو تو کٹ مرو۔ سر دے دو۔ پر نام نہ دو ؛

بیوی۔ بس بس۔ یہ تو تم نے لاکھ باتوں کی ایک کہی۔ دیکھ لینا جہاں اسے کسی نے چڑایا۔ اور اُسے ضد چڑھی ؛ جاؤ بس جلدی جاؤ۔ اور یہی تدبیر کرو۔ یہ خیال رکھنا۔ کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو ؛

میاں۔ مَیں کیا ایسا احمق ہوں ؟ اچھا لو مَیں جاتا ہوں ؛

یہ کہ کر اکبر حسین اُٹھ کر باہر چلے گئے ؛

شام کا جھٹ پٹے کا سا وقت تھا۔ صفدر کی ماں پریشان سر پکڑے بیٹھی تھی۔ کہ صفدر نے دروازے پر آواز دی۔ ذرا پردہ کروا دینا۔ میں آتا ہوں ؛

ماں۔ دوسرے کمرے میں چلا آ۔ ادھر کوئی بی بی نہیں ؛

صفدر باہر کا دروازہ کھول اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ اور ماں سے کہنے لگا۔ کہ اماں جان تم صفیہ کے بیاہ میں کیوں آئی ہو ؟

ماں۔ بیٹا بھلا یہ ہو سکتا ہے۔ کہ ایسے قریبی رشتے میں مَیں شامل نہ ہوں ؟

بیٹا۔ نہیں تم کو ابھی یہاں سے چل دینا چاہئے۔ ہمارا اب اُن سے

سے کیا واسطہ؟

ماں۔ واسطہ کیوں نہیں؟ بیٹا جو رشتہ پہلے تھا۔ وہی اب موجود ہے ۔

بیٹا۔ خیر کچھ ہی ہو۔ مَیں تو اب یہاں نہیں ٹھیرتا۔ مَیں رات کی گاڑی میں گھر جاتا ہوں ۔

ماں (گھبرا کر) یہ کیوں؟ بیٹا ایسے وقت میں جاؤ گے تو چچا جان کیسے ناراض ہونگے؟

بیٹا۔ مجھے کسی کے ناراض ہونے کی کچھ پروا نہیں ۔

ماں نے جب دیکھا کہ لڑکا تو ہاتھوں سے چلا تو کہا!

ماں۔ اگر ایسا ہی تھا۔ تو پہلے ہی کیوں آئے تھے؟

بیٹا۔ تم نے کہا چل۔ وہاں تیرا جی بہلے گا۔ مَیں چلا آیا۔ یہاں آ کر جی بہلنا تو درکنار۔ اُلٹا دل جلتا ہے ۔

ماں۔ وہ کیوں؟

بیٹا۔ جو آتا ہے۔ یہی کہتا ہے۔ کہ سناؤ میاں اپنی بیوی کو اَور کے ہاتھ بیچنے لگے ہو۔ تم سا سودا اگر بھی کوئی نہ ہوگا۔ ہر ایک مجھے چھیڑتا اور ستاتا ہے۔ مَیں یہاں نہیں رہتا۔ نہ رہوں گا۔ نہ کوئی ستائے گا ۔

ماں۔ تو بیٹا کیا کسی نے جھوٹ کہا۔ تمہیں خود رنج نہیں ہوتا۔ کہ تمہاری سولہ سترہ برس کی مانگ اَور لوگ بیاہ لے جائیں۔ اور تم اشراف کے بچے ہو کر بے شرم بے غیرت بنے بیٹھے رہو۔ اس سے زیادہ رسوائی اَور کیا ہوگی؟ صفدر تم خود سوچو کہ کوئی کمینے سے کمینہ۔ پاجی سے پاجی۔

رذیل بھی اس بے عزتی اور رُسوائی کو گوارا کرتا؟

بیٹا۔ جب مجھے مانگ سے کچھ واسطہ ہی نہیں۔ تو میری طرف سے جو چاہے بیاہ لے جائے +

ماں۔ نہیں بیٹا یوں نہیں کہنا چاہئے۔ تیرے دُشمنوں کی مانگ کو لوگ بیاہیں؟

بیٹا۔ تم کچھ پاگل تو نہیں ہو گئی۔ تمہیں اب اس میں کچھ شک بھی ہے۔ کہ اسے کوئی بیاہ نہ لے جائے گا +

ماں۔ شک کی کیا بات ہے۔ تیرے ہوتے اور تیری مرضی کے ہوتے مجال گئی ہے۔ جو کوئی صفیہ کو بیاہ لے جائے +

بیٹا۔ تمہاری یہ سب باتیں فضول ہیں۔ بس واہیات نہ بکا کرو +

ماں۔ اپنی ماں سے کوئی ایسی بھی گفتگو کیا کرتا ہے؟

بیٹا۔ تم ماں ہونے کے قابل بھی ہو +

ماں۔ تو بیٹا مائیں اَور کیسی ہوتی ہیں۔ تمہیں ذرا سے کو پال پوس کر اتنا بڑا کر دیا۔ ابھی تمہاری خاطر میں ہی نہیں آتی +

بیٹا۔ پالا خُدا نے ہے یا تم نے؟

ماں۔ تو وسیلہ تو ہمارا ہی تھا +

بیٹا۔ میں اس فضول جھگڑے کو نہیں سُنتا۔ لاؤ میرا بیگ۔ میں جاتا ہوں۔ اگر تم نہیں چلتیں۔ تو رہو یہاں +

ماں (خوشامد سے) نہ میری جان ایسا نہیں کیا کرتے۔ بیاہ ہو لے تو کر چلیں گے +

بیٹا۔ مَیں قاضی تو نہیں۔ کہ بیاہ میں میرا ہونا ضروری ہے ؛

ماں۔ تو اَور لوگ جو آئے ہیں۔ وہ قاضی ہیں ؟

بیٹا۔ مجھے کسی سے کیا مطلب ؟

ماں۔ بیٹا تُو میرا کہا نہیں سُنتا ؟ دیکھ اب بھی کچھ نہیں گیا۔ میرے لال حامی بھر لے ؛

بیٹا۔ کس بات کی حامی بھروں ؟

ماں۔ یہی صفیہ سے نکاح پڑھوا لے ؛

بیٹا۔ تمہاری تو عقل چرخ کھا گئی ہے۔ ایسی واہیات بے سروپا باتیں کرنے سے کیا فائدہ ؟

ماں۔ صفدر تجھے صفیہ سے کیوں نفرت ہے ؟ اللہ جانتا ہے۔ ایسی خوبصورت ایسی لایق لڑکی ہے۔ کہ سب اُسے دل سے چاہتے ہیں۔ خدا جانے جانے وہ تجھے کیوں بُری لگتی ہے ؟

بیٹا۔ ہَیں۔ صفیہ اور مجھے بُری لگے ؟ مَیں تو اُس کو نہایت عزّت اور محبّت سے دیکھتا ہوں۔ اور مَیں جانتا ہوں۔ کہ وہ میری بہن ہے۔ خُدا اُسے زندہ رکھے ؛

ماں۔ بہن تو نہ کہو ؛

بیٹا۔ (غصّے سے ماں کی طرف دیکھ کر) تو اَور کیا کہوں ؟

ماں۔ وہ تو تیری دُلھن ہے ؛

بیٹا۔ لاحَول ولا قوۃ ؛

ماں۔ صفیہ تجھے اچھی لگتی ہے۔ تو تیرا یہ جی نہیں چاہتا کہ وہ تیری دُلھن بن جائے +

بیٹا۔ تمہیں آج ہو کیا گیا ہے؟ بھلا اب اِن فضول باتوں کے کرنے کا موقع ہے؟

ماں۔ موقع کیوں نہیں؟ موقع ہی موقع ہے۔ تُو چاہے تو آج صفیہ سے تیرا نکاح کروادوں +

بیٹا۔ (ناراض ہو کر) ہُوئیں جو اُس کی دُشمن۔ لالچن + تمہیں لالچ لگ رہا ہے۔ کہ بہت سا دان دہیز آئے گا۔ اور میں اپنا گھر بھروں گی + میں اپنی جان سے بیزار بیٹھا ہوں + مجھے اپنی زندگی کا ذرا بھروسہ نہیں۔ تم نے ہنسی کھیل ہی سمجھ رکھا ہے +

ماں (رو کر) بیٹا تجھے ایسی باتیں کرنی مناسب نہیں۔ میں جو کچھ کہتی ہوں تیری بھلائی کے واسطے کہتی ہوں۔ صفیہ کا دان دہیز جو ہوگا۔ اُس کا مالک تُو ہوگا یا ہم؟ ہم تو بیٹا چند روز کے مہمان ہیں - گور میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ آج مرے کل دُوسرا دن + ہمارے مال دولت کا بھی تُو ہی مالک ہے۔ ہمیں لالچ کس بات کا؟

بیٹا۔ لالچ نہیں تو ہَوَس ہے + دیکھتی ہو کہ میرا کیا حال ہے! مُردے کے ساتھ صفیہ غریب کو مُردہ کرنا چاہتی ہو؟ وہ تندرست ہے۔ لائق ہے۔ کسی اچھے گھر جائے گی۔ اور اپنی جوانی کا پھل پائے گی۔ اس سے لوگوں کو بہت فائدے پہنچیں گے + اور اگر میرے ساتھ بیاہی گئی - تو

کیا ہوگا؟ چند ہی روز بعد اس کا عروسانہ جوڑا رنڈسالے کے جوڑے سے بدل جائے گا۔ تمہیں اس کا کچھ خیال نہیں۔ تو نہ ہوا کرے۔ مگر میں اس کا دشمن نہیں ہوں ٭

ماں۔ بیٹا اگر تُو نے میرا یہ کہا نہ مانا۔ تو مَیں تیرا دُودھ نہ بخشوں گی ٭

بیٹا۔ اگر ایک انسان کی ہمدردی کے صلے میں مَیں والدین کی ناراضگی میں پکڑا جاؤں گا۔ تو مجھے کچھ پروا نہیں ٭

ماں نے جب دیکھا کہ لڑکا کسی طرح راہ پر نہیں آتا۔ تو لگی رونے دھونے۔ اور طرح طرح کی باتیں بنانے ٭ صفدر اس وقت ماں کی حالت دیکھ کر حیران تھا ٭ آخر اُس نے لاچار سوچا۔ کہ یہ سب میری ماں کے خیالی پلاؤ ہیں۔ کہ چچا جان اب بھی صفیہؔ کا بیاہ مجھ سے کر دیں گے۔ بھلا اِس قدر سا مان ہو ہوا کر کہیں ایسا ہوسکتا ہے۔ کہ صفیہؔ مجھے دی جائے۔ چلو مَیں حامی بھر لوں۔ یہ ذکر کریں گی۔ تو آپ ہی مُنہ کی کھائینگی۔ یہ کہ کر بولا کہ کیا تم نے چچا سے وعدہ کر لیا ہے ٭

ماں۔ ابھی تو اُن سے ذکر بھی نہیں آیا ٭

بیٹا۔ تو اچھا اُن سے ذکر کرو۔ اگر وہ دیتے ہیں۔ تو تمہاری خوشی۔ مَیں بیاہ کئے لیتا ہوں ٭

ماں۔ (خوش ہو کر۔ اور چٹ چٹ بیٹے کی بلائیں لے کر) بس مَیں تیری رضامندی چاہتی تھی۔ مجھے یہی ارمان ہے۔ کہ تیرا سہرا دیکھوں۔ اللہ میرا ارمان پُورا کرے۔ اب تُو جا۔ یہ کہ کر صفدر کو رخصت کر دیا۔ اور میاں

کوٹھے میں بُلایا ۔

میاں۔ سُناؤ کیا خبر ہے؟ میں نے تو اُس کے دوستوں کو بے طرح اُس کے پیچھے لگایا ہے ۔

بیوی۔ اے وہ تو بھاگ ہی چلا تھا۔ کیا بتاؤں کن کن مشکلوں سے سمجھا بُجھا کر راضی کیا ہے ۔

میاں۔ ہیں وہ راضی ہوگیا؟

بیوی۔ ہاں اللہ کے صدقے جاؤں۔ کہ اُس کے دل میں کچھ نیکی ڈال ہی دی۔ کہ صفدر نے حامی بھرلی ۔

میاں۔ اچھا اُس نے تو حامی بھرلی۔ اب یہ تجویز کرنی چاہئے۔ کہ کسی طرح بھائی اور بھابی راضی ہوجائیں ۔ وقت کیا رہ گیا ہے؟ صرف دو دن باقی ہیں ۔

بیوی۔ سب سے بڑی بات تو بھائی کے راضی کرنے کی ہے ۔ وہ تو صفدر کو بیٹی دینے پہلے ہی ہچکچاتے تھے۔ اور اب تو بھلا وہ کیوں دینے لگے؟

میاں۔ صفیہ کی ماں بھی تو بڑی ضِدّن ہے۔ وہ کب مانے گی؟ وہ تو اسی معاملے کے باعث ہم سے کچھ ناراض بھی ہے ۔

بیوی۔ عورتوں کی رضامندی مشکل نہیں۔ اور جب خود اُن کے سر کا سائیں راضی ہوجائے گا۔ تو پھر کیا مجال ہے۔ جو وہ راضی نہ ہوں ۔

میاں۔ اچھا تو پہلے صفیہ کے باپ کے آگے ذکر چھیڑوں؟

بیوی۔ ہاں پہلے اُنہیں سے ذکر کرو۔ پھر بیوی سے وہ آپ ہی نپٹ لیں گے + اس وقت تو رات بہت ہو گئی ہے۔ بہتر ہے۔ کہ کل صبح جو کُچھ کرنا ہو کرنا + ایک کام اَور بھی کرو۔ دیکھنا ذکر کرنے سے پہلے وُہ دُعا پڑھ لینا۔ جو شاہ جی نے کچہری میں حاکم کے سامنے پڑھنے کو بتلائی تھی +

میاں۔ مَیں آج رات کو سوؤں گا تھوڑا ہی۔ تمام رات وظیفہ کروں گا اور صبح ہوتے ہی شاہ جی سے جا کر زبان بندی کا تعویذ لاؤں گا۔ کہ ان لوگوں کی زبان ہی بند ہو جائے +

بیوی۔ ہاں جہاں تک ہو سکے۔ اب کچھ فرق نہ اُٹھا رکھو۔ جو دو چار کلمہ کلام مجھے آتے ہیں۔ مَیں بھی اپنی ہمت بھر کروں گی + کلام برحق ہے۔ خدا اُن لوگوں کے دل پھیر دے گا +

اصغر حسین بیٹھے کچھ حساب کتاب کر رہے تھے۔ کہ اُن کے بڑے بھائی نے بُلایا۔ کہ بھئی ذرا یہاں آنا +

اصغر حسین۔ کہئے کیا ارشاد ہے؟

اکبر حسین۔ بھئی تم سے تخلیئے میں کچھ کہنا ہے +

اصغر حسین۔ کہئے یہاں تو تخلیہ ہی ہے +

اکبر حسین (بھائی کے مُنہ کے پاس مُنہ لا کر اور جُھک کر) بھئی یہ حامد علی کون ہیں؟

اصغر حسین۔ آپ کو ابھی تک یہ خبر بھی نہیں۔ کہ یہ کون ہیں؟ یہ میر

واحد علی صاحب کے بیٹے ہیں ❖

اکبر حسین۔ اخّاہ اب معلوم ہوا۔ کہ یہ اُن کے بیٹے ہیں ❖ چھوٹے بیٹے ہیں یا بڑے ؟

اصغر حسین۔ اُن کا تو ایک ہی بیٹا ہے۔ چھوٹے سمجھو یا بڑے ❖

اکبر حسین۔ بھئی یہ کُچھ لائق ہیں ؟

اصغر حسین۔ وہ اپنے تمام خاندان میں نہایت نامور لڑکا ہے ❖

اکبر حسین۔ اور بھئی نوکر چاکر بھی ہے۔ یا بس ہندوستان کے اَور رئیس زادوں ہی کی طرح ہے ❖

اصغر حسین۔ اجی وہ تو سول سرجن ہے ❖

اکبر حسین۔ میرے خیال میں تو یہ جگہ اچھی نہیں ❖

اصغر حسین۔ اور اس سے اچھی اَور کونسی جگہ ہو سکتی ہے ؟

اکبر حسین۔ بیسیوں۔ لڑکوں کا کال پڑا ہے ؟

اصغر حسین۔ کال میں کیا شک ہے ؟

اکبر حسین۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ نے بھی بر کی تلاش میں حیران ہو ہو کر لاچاری میں اس جگہ دینا منظور کیا ہے ❖

اصغر حسین۔ جی نہیں۔ مَیں نے تو خوشی سے اس گھر کو پسند کیا ہے مَیں اس سے بہتر بر نہیں پا سکتا ہوں ❖

اکبر حسین۔ یہ بھی اچھی کہی۔ کیا صفدر حسین اس سے بہتر نہیں تھا ؟

اصغر حسین۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں۔ تو مَیں یہ کہوں گا۔ کہ وہ اس کے

پاسنگ بھی نہیں ؂

اکبرحسین۔ بھائی بڑا افسوس ہے۔ کہ تم میرے بچے کو اس طرح کہتے ہو۔ کیا تمھیں وہ حامد علی سے بڑھ کر عزیز نہیں؟

اصغرحسین۔ عزیزداری اَور بات ہے۔ لیاقت اَور بات ہے۔ صفدر میرا بھنیجا ہے۔ اس واسطے مجھے وہ پیارا ضرور ہے ؂

اکبرحسین۔ اگر پیارا ہے۔ تو آپ اُسے فرزندی میں کیوں نہیں لیتے؟

یہ فقرہ سُن کر اصغرحسین چونک پڑا اور بڑے تعجب اور پیچ و تاب سے یہ جواب دیا۔ کہ آپ یہ کیا فرماتے ہیں؟

اکبرحسین۔ یہ ہی کہتا ہوں۔ کہ صفدر کو فرزندی میں لے لو۔ اَور کیا کہتا ہوں؟

اصغرحسین۔ اگر رضیہ (مری ہوئی بیٹی) زندہ ہوتی۔ تو مجھے کچھ عُذر نہ تھا۔ مگر اب تو میرے پاس اَور کوئی لڑکی ہے نہیں جو آپ کے نذر کروں ؂

اکبرحسین۔ صفیہ کو خدا زندہ رکھے وہ تو موجود ہے۔ اور وہ تو ہے ہی ہماری ؂

اصغرحسین۔ وہ اب تمھاری نہیں رہی۔ وہ اَور کی ہو چکی ؂

اکبرحسین۔ کیوں ہو چکی؟ کیا آپ اس کا نکاح پڑھا چُکے ہیں؟

اصغرحسین۔ نکاح میں اب باقی ہی کیا رہ گیا ہے؟

اکبرحسین۔ اگر نامزد کرنے کو نکاح کہو۔ تو اس حساب سے تو وہ ہماری ہے

اور پہلا حق ہمارا ہے۔

اصغر حسین۔ آپ کا کیا حق رہا۔ جب کہ آپ نے کورا جواب دے دیا ہے۔ اب آپ بے حق ہیں۔

اکبر حسین (غصّے سے چیخ کر) کون سُسرا مجھے بے حق کرنے والا ہے؟ آ تو جائے میرے مقابلے میں۔ اگر تن سے سر جُدا کر کے نہ دکھا دوں۔ تو میں بھی اکبر حسین نہیں۔ گھر بیٹھ کے نہیں۔ عدالت میں جا کر فیصلہ کروں گا۔

اصغر حسین (آہستگی سے) بھائی صاحب آپ ناراض کیوں ہوتے ہیں؟ اگر آپ عدالت جائیں گے۔ تو اَور کسی کو کیا عدالت کی راہ معلوم نہیں۔ آپ کا خط جس میں آپ نے انکار لکھا ہے۔ عدالت کے سامنے میز پر رکھ دیا جائیگا۔

اکبر حسین۔ اصغر حسین۔ اگر گھر میں امن چاہتا ہے۔ تو یہ ضد ہرگز نہ کر ورنہ شادی میں غمی پڑ جائے گی۔

اصغر حسین۔ آپ ہی فرمائیں کہ میں ایک اَن ہونی بات کس طرح کروں؟

اکبر حسین۔ اچھی طرح کرو۔ صفدر کے ساتھ صفیہ کا نکاح کر دو۔

اصغر حسین۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ جو صورت اس وقت پیش ہے۔ وہ آپ پر روشن ہے۔ میں دوبارہ آپ کو جتانا فضول جانتا ہوں۔

اکبر حسین۔ میں اس صورت کی اتنی پروا بھی نہیں کرتا جتنی اُڑد پر سفیدی۔

اصغر حسین۔ آپ کو پرواہ نہیں تو نہ ہو۔ مجھے تو ہے۔ کیا مجھے دنیا میں مُنہ نہیں دکھانا؟

اکبرحسین۔ تو ہم کچھ ہُوئے ہی نا۔ ہم سے رشتہ ناطہ کرتے تم بے عزت ہوتے ہو*

اصغرحسین۔ آپ کیوں نہیں؟ آپ میرے بھائی ہیں میرے بزرگ ہیں۔ باپ کی جگہ ہیں۔ مَیں آپ کا تابعدار ہوں۔ مگر ایسی باتوں میں جو راہ سر کی ہوں*

اکبرحسین۔ راہ سر کی تمہارے نزدیک یا میرے نزدیک؟

اصغرحسین۔ دُنیا کے نزدیک؟

اکبرحسین۔ دُنیا کو ڈالو چُولھے میں*

اصغرحسین۔ دُنیا کو چُولھے میں ڈال کر خود کہاں رہیں؟

اکبرحسین۔ اصغرحسین خدا اور رسول کے واسطے میری سفید داڑھی کا خیال کر۔ یہ کہ بھائی کا ہاتھ اپنی ڈاڑھی کو لگایا۔ اور سر پر سے صافہ اُتار کر اصغرحسین کے پاؤں میں ڈال دیا*

اب تو اصغرحسین بھی بڑے دق ہوئے+ اس وقت وہ اس قدر غمگین اور پریشان تھے۔ کہ ان کے ہوش وحواس بجا نہ تھے+ بھائی نے اُنہیں ایسا مجبور کر رکھا تھا کہ عذر کرتے نہ بنتی تھی۔ نہ اقرار کرتے۔ اور ادھر وقت قریب تھا۔ تمام سامان ہو چکا تھا+ آخر بولا۔ کہ کل تو بارات آنے والی ہے۔ ناحق کو خون خرابے ہوں گے۔ مَیں اب کیا کروں؟

اکبرحسین۔ ان کہ‌ نار دے دو۔ کہ نکاح صفدرحسین سے ہو گیا ہے۔ تم مت آؤ*

اصغر حسین۔ اس سے کیا فائدہ ہوگا؟
اکبر حسین۔ یہی کہ وہ نہیں آئیں گے۔
اصغر حسین۔ نہیں وہ ضرور آجائیں گے۔
اکبر حسین۔ اس بات کا میں ذمہ وار ہوں۔ کہ اس طرف سے تم کو کوئی بدنامی نہیں ہونے پائے گی۔
اصغر حسین۔ نہیں بھائی یہ معاملہ اب نہیں ہو سکتا۔ صفیہ کی ماں کبھی نہیں مانیں گی + حامد علی ان کے دور کے رشتہ داروں میں ہیں۔ وہ یہ کب پسند کریں گی۔ کہ اُن سے واسطہ چھوڑ کر ناحق اُن کو ناراض کریں۔
اکبر حسین۔ یہ سب تمہارے عذر ہیں + اولاد کے حق میں باپ سے بڑھ کر ماں کو کوئی دخل نہیں + ان کے دُور کے رشتے کے بگڑنے کا تمہیں خیال ہے۔ اور اپنے بازو کے ٹوٹنے کا ملال نہیں؟ دراصل تم کو اس زن مریدی نے مارا + آپ مجھے صفیہ کے حق میں اجازت دے دیں۔ اور خود چُپ رہیں۔ دیکھو کوئی میرا کیا کرتا ہے؟
اصغر حسین۔ تو میں اس کی ماں کو ناحق کا رنج دوں؟
اکبر حسین۔ میں تمہیں کہتا ہوں۔ کہ تم اس معاملہ میں دخل نہ دو + اگر تمہیں بھابی کی دلداری کرنا مطلوب ہے۔ تو چلو میں اُن کی بھی خوش کر لوں گا۔ تو کچھ قباحت نہ رہے گی۔
اصغر حسین۔ ان سب قباحتوں سے بڑھ کر ایک قباحت اَور ہے۔
[اکبر حسین]۔ وہ بھی کہو۔

اصغر حسین۔ وہ یہ ہے۔ کہ صفیہ صفدر حسین کو بہت ناپسند کرتی ہے ÷

اکبر حسین۔ لاحول ولا قوۃ۔ خوب قباحت نکالی۔ پڑھ لکھ کر تمہاری عقل ماری گئی ہے؟ مرد آدمی! بیٹی کا بیاہ کرنا اور اُس سے یہ پُوچھنا کہ تو کس خاوند کو پسند کرتی ہے کبھی اشرافوں میں ایسا ہُوا ہے؟

اصغر حسین۔ تو اس میں رزالت ہی کون سی ہے؟

اکبر حسین۔ بیٹھو بھی۔ علم نے تمہاری عقل کھو دی ہے۔ تمہیں خللِ دماغ ہو گیا ہے ÷

اصغر حسین۔ خیر کچھ ہی ہو۔ مَیں کبھی وہ بات نہ کروں گا جس سے میری پیاری صفیہ کا دل دُکھے ÷

اکبر حسین (نہایت غُصّے کے لہجے میں) بہت اچھا۔ آپ جانیں۔ اور آپ کا کام جانے۔ بس مَیں رُخصت ہوتا ہوں۔ اور انشاءاللہ اب آپ جیتے جی میری صُورت نہ دیکھیں گے ÷ یہ کہہ کر اکبر حسین وہاں سے چل دئے۔ اور بیوی سے کہا۔ کہ بوریا بستر باندھو۔ اور چلو۔ مجھے اب یہاں کا دانا پانی حرام ہے ÷ اصغر حسین میری ایک نہیں مانتا۔ اور اپنے ارادے سے نہیں ٹلتا پر نہیں ٹلتا ÷

یہ سُن کر والدۂ صفدر کو بھی بہت صدمہ ہُوا۔ اور دونو میاں بیوی نے اپنا بوریا باندھا باندھ چلنے کی تیاری کر دی ÷ صفدر تو یہاں سے نکلنے کا بہانہ ہی ڈھونڈھتا تھا۔ اب تو اس کی بن آئی۔ وہ بہت خوش ہُوا۔ کہ چلو سستے چھوٹے ÷

اصغر حسین گھر میں آئے۔ تو آہستہ سے بیوی سے کہنے لگے۔ کہ کچھ اَور نئی بات بھی سُنی +

بیوی۔ وہ کیا؟

اصغر حسین۔ بھائی کہتے ہیں۔ کہ اب صفیہ کا عقد صفدر حسین سے کر دو +

بیوی۔ حیران ہوکر۔ ایں! یہ انہیں کیا سُوجھی ؟

اصغر حسین۔ بھلا خیال تو کرو۔ کہ اس حماقت کا بھی کوئی ٹھکانا ہے؟ بیاہ کی تاریخ مقرر ہو چکی۔ شادی میں ایک دن باقی رہ گیا۔ پُوچھو مَیں یہاں یہ گُل کھلاؤں۔ تو مَیں چار بھلے مانسوں میں کیا مُنہ دکھلانے کے لائق رہونگا؟

بیوی۔ بلا سے اگر ایسا ہی تھا۔ تو جب بات چیت ہو رہی تھی۔ تب ہی کہتے۔ بر جہنم مَیں صفدر کی نالائقیوں کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لیتی اور اُن کو خوش کر دیتی۔ مگر اب کیا ہوتا ہے ؟

اصغر حسین نے بھائی کے مُنہ سے جو جو باتیں سُنی تھیں سب کی سب بیوی کے آگے دُہرادیں۔ اور کہا اب یہ بھی بُرا معلوم ہوتا ہے۔ کہ عَین وقت پر بھائی رُوٹھے جاتے ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے؟

صفیہ کی ماں کو۔ اور سچ تو یوں ہے۔ کہ باپ کو بھی صفدر سے بہت مُحبت تھی۔ گو صفدر نالائق تھا۔ مگر اس کی بھولی بھولی صُورت اور اُس کی وہ محبّت جو اپنے چچا اور چچی سے رکھتا تھا۔ ان دونو ہی میاں بیوی کے دل پر نقش تھی۔ اور بار بار صفدر کی سفارش کرتی تھی + مگر کیا کرتے موقع ہی ایسا پیش آگیا تھا۔ کہ کچھ بن نہ پڑتی تھی + یہ میاں بیوی اس

قسم کے صلاح و مشوروں میں مشغول تھے۔ کہ کسی طرح ایسا معاملہ ہو۔ کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ ادھر اکبر حسین نے تیاری کر اسباب کے واسطے گاڑی اور بیوی کے واسطے ڈولی لا دروازے پر لگادی۔ نہ بھائی سے ملے نہ بھاوج سے رخصت ہوئے۔ تینوں کے تینوں چل دئے۔ ایک نوکر نے آن کر اطلاع دی کہ بیگم صاحبہ بڑے میر صاحب تو اپنا اسباب اور گھر کے آدمیوں کو لے کر چلے گئے ہیں ٭

صفیہ کی ماں (چونک کر) سچ کہو۔ اے ہے۔ ایسے ناراض ہوئے کہ مل کر بھی نہ گئے ٭

صفیہ کا باپ تو یہ لفظ سُن کر خاموش رہ گیا۔ اُسے اپنے بھائی کے ساتھ بے انتہا محبّت تھی۔ اُس نے بجز اس ایک نافرمانی کے جو صفیہ کے بارہ میں ہوئی اپنے بھائی کا حُکم کبھی نہیں ٹالا تھا۔ وہ اُس کو اپنے باپ کی بجائے جانتا تھا۔ یہ دونو بھائی جب کبھی ایک دُوسرے سے رُخصت ہوا کرتے تھے۔ تو عورتوں کی طرح گلے مل مل کر روتے تھے۔ آج اُسے بڑے بھائی کی یہ سرد مہری دیکھ کر کہ وہ بے ملے ہی چلے گئے تاب نہ رہی۔ اور اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ صفیہ کی ماں کو بھی بہت صدمہ ہُوا۔ آخر اُس نے آنسو پونچھ کر کہا۔ کہ اب بیٹھے کیا دیکھتے ہو۔ جاؤ جس طرح بنے اُن کو روک لاؤ ٭

اصغر حسین۔ اب مَیں کہاں جاؤں۔ خدا جانے وہ کہاں گئے ہیں۔ یقین تو یہی ہے۔ کہ ریل پر گئے ہونگے۔ (گھڑی دیکھ کر) ریل کے آنے

میں تو ابھی ایک گھنٹہ باقی ہے بسب سے پہلے مجھے سٹیشن ہی پر دیکھنا چاہئے مگر میں کیا کروں۔ کیا اب وہ میرے گھر واپس آئیں گے؟ ہرگز نہیں۔ جب تک اُن کی ضد پوری نہ ہو۔ وہ کب ماننے والے ہیں؟

بیوی۔ اے تم جاؤ تو سہی جس طرح بنے منّتیں سماجتیں کرنا کسی طرح منا ہی لینا ۔

میاں۔ وہ بچّہ تو ہیں ہی نہیں۔ جو مَیں ان کو گودی میں اُٹھا لاؤں گا ۔

بیوی۔ تو بہتر تم۔ جو کچھ وہ کہیں سو ہی مان لینا۔ جو تقدیر میں ہوگا ہو جائیگا ۔

غرض اصغر حسین نے جلدی جلدی کر کے گاڑی تیار کروائی۔ اور اُس پر سوار ہو بھائی کے پیچھے گئے اسٹیشن پر جا کر دیکھا۔ تو اکبر حسین اسباب ریل میں رکھ چکے تھے۔ ٹکٹ لے لئے تھے۔ بھاوج بھی سوار ہو چکی تھی۔ اکبر حسین اِدھر اُدھر پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے۔ ریل کی سیٹی ہونے کو تھی۔ اور اکبر حسین بھی اب اس میں سوار ہونے لگے تھے۔ کہ دفعتاً اصغر حسین جا موجود ہوئے۔ اور ریل کا دروازہ کھول کر کہا۔ کہ بھائی آپ بہت جلد نیچے اُترئے ۔ ابھی وہ کچھ کہیں ہی کہیں۔ اُنہوں نے ہاتھوں ہاتھ اسباب ریل میں سے اُتار پلیٹ فارم پر رکھ دیا۔ اور بھاوج کو بھی اُترواکھڑا کر دیا ۔ اکبر حسین سے بہت کچھ عذر معذرت کی۔ اور کہا کہ بھائی جو آپ کا حکم ہوگا۔ سو ہی میری خوشی ہو گی۔ آپ گھر چلئے ۔

اکبر حسین۔ تو آپ یہاں ہی سے ایک تار اس مضمون کا حامد علی کو دیدیں کہ آپ اپنا آنا ملتوی کر کے خط کا انتظار کریں ۔

اصغر حسین۔ آپ گھر چلیں۔ وہاں سوچ سمجھ کر جو مناسب ہوگا کیا جائیگا۔

یہ کہہ اور بھائی بھاوج کو لے کر گھر پہنچے +

اصغر حسین۔ کہئے بھائی اب کیا کروں ؟

اکبر حسین۔ لکھ دو کہ صفدر حسین سے صفیہ کا عقد ہو گیا ہے۔ اس واسطے تم مت آؤ۔ اور آج ہی تیسرے پہر صفیہ کا عقد کر دو۔ رُخصت کی رسم بعد میں ادا کرنا + جب عقد ہو جائے گا۔ تو وہ لوگ کچھ کر ہی نہیں سکتے + دوسرے اس معاملے میں اُن کی شرافت بھی ظاہر ہو جائے گی۔ اگر شریف ہونگے تو خاموش ہو رہیں گے۔ ورنہ کمینہ پن کریں گے۔ اور کمینہ پن کریں گے تو میں اُن کے واسطے اکیلا کافی ہوں +

اصغر حسین نے اب اس معاملے میں اپنی اور اپنی بیوی کی راے کا دخل دینا بالکل ترک کر دیا تھا۔ جو بھائی نے کہا سو اُس نے کیا +

باب ہفتم

دام میں پھنس کے نکلنا ترا نا ممکن ہے
تا بمقدور پر و بال ہلا لے بُلبُل

اس وقت بدنصیب صفیہ اپنی قسمت سے بے خبر ایک تنہا کمرے میں مایوں کا جوڑا پہنے بیٹھی ہے + اس وقت اس کے چہرے سے نہ خوشی

ہی کے آثار نمایاں ہیں اور نہ رنج کے۔ مگر کسی اُلجھن میں ضرور اُلجھ رہی ہے۔ وہ اپنے خیالات میں غرق بیٹھی تھی۔ کہ یکایک اُس کے دروازے کے کواڑوں کے کھُلنے نے اُس کے خیالات کے سلسلے کو توڑ دیا۔ اور اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا کہ اُس کی پیاری ہنیلی آمنہ چلی آ رہی ہے ؛

صفیہ۔ سلام بہن آمنہ تمہاری بڑی عمر ہے۔ مَیں تمہیں یاد ہی کر رہی تھی۔ اچھا ہُوا جو تم آگئیں ؛

آمنہ۔ کہو آج میرا ایسا سخت انتظار کیوں ہُوا ؟

صفیہ۔ کچھ نہیں۔ بہن کیا کہوں ؟ کل سے میرا جی آپ ہی آپ گھبرائے جاتا ہے۔ جانے اسے کیا ہو گیا ہے ؛ کتاب دیکھتی ہوں تو اُس میں دل نہیں لگتا۔ جو سلائی لے بیٹھتی ہوں۔ تو امّاں جان کچھ کام نہیں کرنے دیتیں۔ کہ بیٹی ان دنوں آرام کرو۔ کچھ اس نکمّے رہنے نے میرا دل اُچاٹ کر دیا ہے ؛

آمنہ۔ دل کیوں نہ اُچاٹ ہو؟ اب تو سُسرال میں جا کر جی لگیگا ؛

صفیہ۔ ہَیں تم تو مجھے اسی طرح چھیڑا کرتی ہو۔ بھئی ہم سے ایسی باتیں نہ کیا کرو ؛

آمنہ۔ تو کیا مَیں کچھ جھوٹ کہتی ہوں۔ مَیں نے تمہارے دل لگتی بات کی ہے ؛

صفیہ (بات کاٹ کر) اے ہاں بہن یہ بڑے ابّا اور بڑی اماں کیوں رُوٹھ کے چلے گئے تھے ؟

آمنہ۔ کیا تمہیں خبر نہیں؟

صفیہؔ۔ مَیں نے تو کچھ نہیں سُنا۔

آمنہ۔ خُوب بیاہ شادی ہے۔ خیر سے دُلھن کو یہ بھی خبر نہیں۔ کہ بیاہ کس سے ہے؟

صفیہ۔ کس سے کے کیا معنے؟ وہ تو معلوم ہے۔

آمنہ۔ خاک معلوم ہے۔ اجی وہ تو وہیں کے وہیں دھرے رہے یہاں پھر صفدر حسین سے تمہارا عقد کرنے کی تجویز ہو رہی ہے۔

صفیہؔ۔ ہے ہے بوا تم کیسی باتیں کرتی ہو! توبہ توبہ کرو۔ کہیں ایسا بھی ہُوا ہے بھئی تمہیں ہنسی کرنی ہو۔ تو اَور باتوں میں ہنسی کر لیا کرو۔ ایسی باتوں میں ہنسی اور مسخراپن نہ کیا کرو۔ مَیں پرلے درجے کی مُراقن ہوں۔ مجھے ناحق وہم ہونے لگتا ہے۔

آمنہ۔ جو ہنسی کریگا اُس کا مُنہ کالا۔ اری دیوانی تجھے کچھ خبر بھی ہے؟

صفیہؔ۔ سچ کہو۔ اچّھا کھاؤ میرے سر کی قسم۔

آمنہ۔ تیری جان کی قسم۔ جو کچھ کہ رہی ہوں سچ کہتی ہوں۔ بھلا مجھے کیا دیوانے کُتّے نے کاٹا تھا۔ جو مَیں ایسے وقت میں ایسی پاگلوں کی سی ہنسی کرتی۔

یہ سُن کر صفیہؔ کے چہرہ کا رنگ اُڑ گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بدن میں ایک طرح کی کپکپی شروع ہو گئی۔ اُسے ایسا معلوم ہُوا جیسے اس پر کوئی بجلی ٹُوٹ پڑی ہے۔ آہ وہ چند لمحے پہلے کیسے کیسے خیال سوچ

رہی تھی + وہ اپنے دل میں کیا کیا منصوبے باندھ رہی تھی۔ چند لمحے پہلے وہ اپنے تصور میں اپنے سسرال پہنچی ہوئی تھی۔ زرلبفت کا جوڑا پہنے ایک نہایت سجے ہوئے مکان میں بیٹھی تھی + درودیوار سے خموشی برس رہی تھی - کہ یک بیک اس کے نازک دل پر قیامت ٹوٹ پڑی + وہ حیران پریشان ایک بُت کی طرح بنی رہ گئی ؞

آمنہ۔ بُوا خیر تو ہے ؟ تم تو بہت ہی گھبرا گئیں۔ گھبرانے کی کیا بات ہے۔ تم تسلی رکھو۔ جو نصیب میں ہونے والا ہے۔ وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔ اور یہ کونسی انوکھی بات ہے۔ آخر تم جس دن جس گھڑی سے پیدا ہوئیں تھیں۔ اُسی دن سے اُس کے ساتھ نامزد ہو چکی تھیں ؞

صفیہ۔ ہائے بُوا اس وقت تم کچھ مت بولو + آہ میرے دل کا حال کون جان سکتا ہے ؟ میں کس طرح اپنے ناشاد دل کو سمجھاؤں + ہائے میرے ابّا جان اور امّاں جان ! تمہیں کیا ہوا۔ تمہاری غیرت اور حمیت کدھر گئی ؟ غضب خدا۔ بیاہ کی تاریخ ٹھیری ہوئی۔ اور اُس پر یہ آفت !!! اے صفیہ تو دیوانی تو نہیں ہو گئی ہے + تُو نے آمنہ سے یہ باتیں خواب میں تو نہیں سُنی ہیں ؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ تم سچ سچ کہو۔ کہیں تم نے جھوٹ نہ سُنا ہو ؞

آمنہ۔ اری بی بس بھی کرو۔ ایسی ہی میں ننھی بچی ہوں۔ چلو اگر میں نے جھوٹ سُنا ہے۔ تو یوں ہی سہی۔ جب نکاح ہوگا۔ اس وقت جو کچھ ہوگا سُن لینا ؞

صفیہ۔ ہائے میں نکاح کے وقت تک زندہ نہ ہوں گی ؟ خدا مجھے ابھی موت دے ؞

آمنہ۔ اے بہن اللہ اللہ کرو۔ تمہیں یہ کیا ہوگیا ہے؟ تم کیسی بہکی بہکی باتیں کرتی ہو؟

صفیہ۔ بہن کیا کروں؟ اگر واقعی یہ امر صحیح ہے اور سچ ہے۔ تو مجھ سے یہ بے عزتی نہیں اُٹھائی جائیگی + امّاں جان اور ابّا جان نے تو زال سخت کر لیا اور عزت کی طرف سے آنکھوں پر پٹّی باندھ لی۔ الٰہی سارِی دُنیا کیا کہے گی؟ ہائے کس قدر رُسوائی ہوگی۔ جب وہ برات والے بھی برات لے کر آن پہنچیں گے!!

آمنہ۔ نہیں وہ اب نہیں آئیں گے۔ لڑکے والوں کو تمہارے بڑے ابّا نے تار دے دیا ہے اور منع کر دیا ہے۔ کہ تم مت آؤ۔ عقد سفدر حسین کے ساتھ ہوگیا ہے ✤

صفیہ۔ سچ کہو؟

آمنہ۔ توبہ! تو میں جھوٹ کہہ رہی ہوں؟

صفیہ۔ بُوا خدا تمہارا بھلا کرے۔ تم نے مجھے ان باتوں کی خبر کر دی۔ ورنہ میرے تو فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی۔ کہ کیا ہو رہا ہے۔ اب میں . . .

اتنے ہی میں باہر سے آواز آئی۔ اور آمنہ باہر چلی گئی ✤

صفیہ کی آنکھوں میں اس وقت دُنیا اندھیر تھی + اُسے پاسِ عزت دُنیا میں ایک دم رہنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ وقت بہت کم تھا۔ اور اس بدنصیب کا راگ زیادہ + وہ حیران تھی۔ کہ میں اس وقت کیا کروں۔ عصر کا وقت نکاح کا قرار دیا گیا ہے۔ صرف چار گھنٹے ۱۰

میں باقی ہیں۔ کیا مَیں اپنی اماں کو لکھ کر بھیجوں۔ اور اُن سے پوچھوں۔ اور اُن کو منع کروں۔ کہ خدا کے واسطے یہ کیا اندھیر کرتی ہو۔ اور اس سے باز آؤ۔ اور ابا جی کو سمجھاؤ۔ اب کس مُنہ سے اُن کا کہا مان لیا۔ لیکن نہیں۔ اماں جان تو مجھ پہ بہت ہی خفا ہونگی۔ مگر نہیں خفگی سے میری نجات تو ہو جائیگی۔ لیکن نہیں میری قسمت ایسی کہاں؟ وہ ابا جان تک میری بات ہرگز نہیں پہنچائیں گی+ اچھا تو مَیں دو حرف ابا جان کو ہی کیوں نہ لکھ دوں؟ وہ تو مجھ پر خفا بھی نہیں ہونگے۔ ایسا ہی ہوگا تو بُرا مانیں گے۔ سو خیر مانا کریں۔ مَیں ہمیشہ اُن کی تابعدار رہی ہوں۔ کیا میری تابعداری کا یہی حق ہے۔ جو آج وہ ادا کرنے لگے ہیں؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ مَیں کس مُنہ سے دُنیا میں زندہ رہوں گی۔ جو کوئی سُنے گا کیا کہے گا؟ مجھے چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیے+

صفیہ اپنے ایسے ہی خیالوں میں غرق بیٹھی تھی۔ کہ گھڑی نے ٹن ٹن بارہ بجا دئے۔ بارہ بجے کا وقت دیکھ کر اُس کے رہے سہے اوسان خطا ہو گئے اور وہ نہایت گھبراہٹ کے عالم میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے سردست اپنے دل سے فیصلہ کیا۔ کہ اب ابا جی کو خط لکھوں۔ جو ہو سو ہو۔ جلدی جلدی اُس نے قلمدان اُٹھایا۔ اور "ہر چہ بادا باد ما کشتی درآب انداختیم" کہ کر وہ اس طرح خط لکھنے لگی:۔

دوزخ میں بھیج دیں مجھے وہ یا بہشت میں
یہ اختیار ہے مِرے مختار کے لئے

میرے پیارے ابا جی۔ آداب عرض ہے۔ میرے واسطے آج وہ بدنصیب دن آپہنچا ہے۔ جبکہ میں اپنے پیارے ابا جی کے قدموں سے علیحدہ کی جاتی ہوں اور پیاری ماں کی گود سے ہٹائی جاتی ہوں + میرے پیارے ابا جی میں نے اس وقت ایک عجیب خبر سُنی ہے۔ جو نہایت ہی افسوس ناک اور شرم ناک ہے۔ خدا کرے کہ وہ خبر غلط ہو۔ لیکن نہیں وہ خبر غلط نہیں + اگر واقعی یہ خبر درست ہے۔ تو میں عرض کرتی ہوں۔ کہ برائے خدا آپ اس معاملہ پر ایک بار پھر غور کریں + قبلہ دو جہان میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ کہ آپ مجھ سے زیادہ عقلمند ہیں۔ آپ مجھ سے زیادہ سن رسیدہ اور تجربہ کار ہیں۔ لیکن اسے قبلۂ من جو درد میرے پہلو میں ہو گا۔ اُسے میرے بتائے بغیر آپ اپنے دل میں محسوس نہ کرسکیں گے۔ خواہ آپ ڈاکٹر اور حکیم حاذق ہی کیوں نہ ہوں + پس اے میرے پیارے ابا جی۔ اگر واقعی وہ خبر درست ہے۔ تو للہ صفیہ پر رحم فرمائیں۔ اور اُس خبر کو غلط ثابت کریں۔ والسلام۔ کنیز صفیہ +

یہ خط لکھتے تو صفیہ نے جلدی اور گھبراہٹ میں کانپتے ہاتھوں سے لکھ دیا۔ لیکن جب لکھ چکی۔ تو اُس نے اُسے دوبارہ پڑھ کر پھر اپنے دل سے یہ گفتگو کی۔ کہ لکھنے کو تو میں نے لکھ دیا ہے۔ لیکن اگر والد صاحب نہ مانا۔ تو میں کیا کرلونگی؟ اب وقت ہی کیا رہ گیا ہے۔ وہ زبردستی کر دینگے + لیکن میں خود اس عمر کو پہنچ چکی ہوں۔ کہ کوئی مجھ پر زبردستی نہیں کرسکتا مگر ماں باپ کی تجویز سے میں نے انکار کیا۔ تو سارے خاندان میں نکّو ہو جاؤنگی + یہ تھوڑی بدنامی ہے۔ لوگ مجھے کیا کہیں گے ہاں میرے والدین کو تو عزت

کی پرواہی نہیں۔ اگر اُنہیں عزّت کا خیال ہوتا تو ایسا کرتے ہی کیوں؟ پھر اب کیا کروں؟ خط بھیج ہی دوں؟

یہ کہکر خط کو لفافہ میں بند کیا ہی تھا۔ کہ پھر کچھ سوچ کر یکایک لفافے کو پھاڑ ڈالا۔ جیسے کوئی بات لکھنی بھول جاتی ہے۔ اور اُس کے لکھنے کو دوبارہ لفافے کو کھولتا ہے۔ پھر اُسے پڑھا اور اپنے آگے رکھ کر کہنے لگی۔ کیا یہ سب فضول جھگڑے ہیں؟ مجھے بہتری سے زیادہ بدتری کی اُمید رکھنا چاہئے۔ ایسا ہونا تو کسی طرح بھی ممکن نہیں کہ اب وہ وقت ٹال دیں؟ پھر کچھ سوچ کر اُسے خدا جانے کیا خیال آگیا۔ کہ ایک دم کے واسطے اُس کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں ہوگئے؟ اس نے یہ سوچا کہ جب میرا نکاح ہونے لگے۔ تو ضرور ہے مجھ سے دریافت کریں۔ مَیں صاف انکار کر دونگی۔ اور آمنہ سے کہتی ہوں۔ کہ وہ اپنے باپ سے کہے۔ کہ وہ حامد علی کو تار دے دیں۔ کہ تمہیں جو تار دئے گئے ہیں۔ اُن کی کچھ اصلیت نہیں ہے تم چلے آؤ؟ اتنے یہاں بیاہ کے اقرار کا جھگڑا رہے گا۔ اتنے میں وہ لوگ بھی آجائیں گے۔ پھر تو اُن کے ہوتے مجال نہیں۔ کہ یہ معاملہ اس طرح ہو بس یہی کرنا چاہئے؟

یہ سوچ کر اُس نے آمنہ کو بُلوا کر کہا کہ بہن! اگر مجھ سے محبّت رکھتی ہو۔ تو مُجھ پر یہ احسان کرو کہ اُن لوگوں کو ایک تار دلوادو۔ کہ یہ سب خبریں بے اصل ہیں۔ مگر ہاں فساد ضرور برپا ہے۔ تم جلدی آجاؤ؟

آمنہ۔ اگر اس میں تمہارا کچھ فائدہ ہے۔ تو دیکھو مَیں ابھی جا کر تار دلواتی ہوں۔ بہن سچ تو یہ ہے۔ کہ جب سے یہ خبر میرے ابّا نے سُنی ہے۔ اُن کو

بھی بہت ہی سخت رنج اور ندامت ہو رہی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ حامد علی مجھے
کیا کہیں گے۔ کہ انہوں نے ہمیں اچھا پھنسایا ٭

صفیہ۔ ان بچاروں کا کیا بس؟ انہوں نے تو اپنی طرف سے بھلائی میں
کیا کچھ اُٹھا نہیں رکھا ٭

آمنہ۔ اچھّا تو وقت بہت کم ہے۔ اور میں اب جاکر ابّا جی سے کہتی ہوں۔
تاکہ وہ یہ کارروائی کریں ٭

صفیہ۔ ہاں اچھی بہن ضرور ایسا ہی کرنا ٭

آمنہ رخصت ہوئی۔ اور صفیہ پھر اپنی اس غمزدہ داستان کو کھول بیٹھی
ہزاروں منسوبے باندھتی تھی۔ اور چھوڑتی تھی + اب اُس نے یہ
سوچا۔ کہ صفدر کو کہلواؤں۔ کہ بھائی تم مجھے اپنی سگی بہن کی طرح جانو۔ میں
تم کو اپنا بھائی جانتی ہوں۔ شاید وہ ہی مان جائے + مگر ایسا کرنا بھی
بے شرمی معلوم ہوا + اب دو بھی بج چکے تھے۔ نکاح میں صرف دو گھنٹے
باقی تھے۔ اور یہ بدحواس بیٹھی تھی۔ کہ اب میں کیا کرونگی؟ آخر اُس نے یہ
فیصلہ کیا۔ کہ جب مجھ سے میری رضامندی پوچھی گئی۔ تو میں نہ ہاں کروں گی
اور نہ نا کروں گی۔ جو چاہیں سو کریں + جب میرے ماں باپ کو غیرت نہیں۔
تو مجھے کیا ہے۔ وہ جانیں اور اُن کا کام جانے + یہ سوچ کر وہ چپکی ہو رہی۔
مگر یہ فیصلہ بھی اُس کا پختہ فیصلہ نہ تھا۔ کہ بہت لاچاری اور مجبوری کا فیصلہ
تھا + وہ ابھی اپنے اُن ہی اندیشوں میں محو بیٹھی تھی۔ کہ آمنہ نے آکر کہا۔
کہ لو بہن مبارک ہو۔ صفدر حسین کہیں بھاگ گیا ہے ٭

صفیہ۔ شکر الحمدللہ۔ الٰہی تیرا ہزار ہزار شکر ہے۔ تُو نے مجھ دُکھیا پہ رحم فرمایا میری ناؤ کو خیریت کے ساتھ کنارے لگا ۔

آمنہ۔ آمین۔ مگر اس کا باپ اس کو جہاں تہاں ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ ڈر ہے۔ کہ ڈھونڈھ نہ نکالے۔ چچا کو بھی سخت فکر ہے ۔

صفیہ۔ کب سے کھوئے گئے؟

آمنہ۔ دو بجے سے غائب ہیں۔ رقعہ لکھ کر گیا ہے۔ کہ آپ لوگ گھبرائیں نہیں۔ مَیں صرف اس واسطے یہاں سے رُوپوش ہو گیا ہوں۔ کہ مجھے صفیہ سے نکاح کرنا منظور نہیں۔ اور اس کا نکاح اَور سے ہوتے دیکھنا بھی گوارا نہیں۔ جب صفیہ کا عقد ہو چکے گا۔ اور وہ اپنی سُسرال رُخصت ہو جائے گی۔ تب میں آ جاؤں گا ۔

صفیہ۔ صفدر نے اگرچہ لیاقت حاصل نہیں کی۔ مگر سچ تو یہ ہے۔ کہ وہ بہت ہی سمجھ دار اور دُور اندیش اور خدا ترس انسان ہیں۔ خدا اُن کو زندہ رکھے اور اُن کے ماں باپ کا کلیجہ ٹھنڈا رہے ۔

آمنہ۔ اب کیوں نہ دُعائیں دو گی؟

صفیہ۔ بہن سچ کہو۔ میں نے پہلے کبھی اُن کو بد دُعا دی ہے! یہ اَور بات ہے۔ کہ مَیں اُونچ نیچ سوچ کر اُن کے ساتھ بیاہا ہی جانا پسند نہیں کرتی۔ مگر ساتھ ہی اس کے مَیں کبھی اُن کو بد دُعا بھی نہیں دیتی ۔

باب ہشتم

ہم آپ اُٹھے جاتے ہیں نادم نہ کیجئے
کوُچے سے اپنے کرکے نہ رُسوا اُٹھائیے

غمزدہ صفیہ کو اب تسلّی ہوگئی تھی۔ اور اُس بات کی بے انتہا خوشی تھی۔ کہ میرے خیالات میرے ہی سینے میں بندرہے کسی کے کان تک پہنچنے اور مجھے رُسوا کرنے کے باعث نہ ہُوئے ۔ خُدا نے خود بخود غیب سے اچھا سامان کر دیا۔ شکر الحمدللہ۔ مگر افسوس یہ خوشی اصلی خوشی نہ تھی۔ یہ وقفہ مہلک بیماری کا سنبھالا تھا۔ ابھی پوُری شام بھی نہ ہونے پائی تھی۔ کہ اُس نے یہ سُن لیا کہ صفدر کے باپ صفدر کو ڈھونڈھ لائے ہیں۔ صفدر کو اس وقت شدّت کا بخار چڑھا ہوا تھا۔ اس پر بھی قاضی بُلایا گیا۔ اور نہ کوئی رسم ادا ہُوئی۔ نہ کوئی خوشی منائی گئی چُپکے ہی چُپکے راتوں رات گُڈّے اور گُڑیا کی طرح نیم جان صفیہ کا عقد نکاح جان ہار صفدر حسین کے ساتھ پڑھا دیا گیا۔

صفیہ نے جب یہ سُنا۔ کہ نکاح ہو چکا ہے۔ اور اس سے کسی نے پوُ تک بھی نہیں۔ تو اس پر جو کچھ گزرا وہ گزرا۔ قلم سے وہ لکھا نہ زبان سے وہ ادا نہیں ہو سکتا۔ اور کانوں سے وہ سُ

آدمی سے بُت بن گئی۔ سانس اب تک چلتی تھی۔ مگر اس میں جان نہ تھی۔ آنکھیں کُھلی تھیں۔ مگر اُسے کچھ نہ سُجھائی دیتا تھا۔ اس کا یہ حال تھا۔ کہ چند ظالم بیبیاں آئیں۔ اور صفیہ کے ناک میں سہاگ کی نشانی نتھ پہنا گئیں۔

صفیہ بڑی سخت جان لڑکی تھی۔ ہرچند اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ مگر وہ پھر ایک دفعہ دل مضبوط کر کے اُٹھی۔ اُس نے دیکھا کہ سب اپنے اپنے پلنگوں پر سو گئے ہیں۔ اور وہ بالکل تنہا ہے۔ اس نے قلم دوات اُٹھایا۔ اور کچھ لکھنا شروع کیا۔ اس کے ہاتھ کانپتے تھے۔ سانس رُک جاتا تھا۔ تھوڑی دیر تک لکھتی رہی۔ پھر اپنی تحریر کو لفافہ میں بند کیا۔ اب بھی اُس کی گھبراہٹ کم نہ ہوئی تھی۔ وہ پھر اُٹھی وضو کیا۔ نماز پڑھی۔ قرآن مجید کھولا۔ کچھ اُسے پڑھا۔ دونو ہاتھ اُٹھا کر کچھ دعا مانگی۔ پھر بہت دیر تک سجدے میں رہی۔ اس کے بعد گھڑی ہاتھ میں لے کر اپنی نبض گننے لگی۔ پھر چُپ چاپ اپنے پلنگ پر جا کر لیٹ رہی۔

باب نہم

کاتو سب حال چھوڑو یہاں ۔۔ سنو بیٹے والوں کی اب داستاں

علی کے پاس متواتر دو تار اس مضمون کے پہنچے ۔ کہ صفیہ

کا عقد صفدر سے ہوگیا ہے۔ مگر اُس نے ان تاروں کو بناوٹی اور جھوٹے تار سمجھا۔ لیکن دل میں گھبراتا بہت تھا۔ کبھی سوچتا تھا۔ کہ کہیں خدا نخواستہ یہ بات سچ ہی نہ ہو۔ کبھی کہتا تھا۔ کہ شاید سُسرال والوں نے یہ بھی مجھ سے ایک ہنسی کی ہے۔ کبھی خیال کرتا تھا۔ کہ اکبر حسین نے دُشمنی سے یہ تار دیا ہے۔ غرض اُس نے اپنے ان وہموں کو چھوڑکر حُسن ظن سے کام لیا۔ اور برات لے جانے کی تیاری کی ۔

اگرچہ حامد علی فضول رسومات سے گھبراتا تھا۔ لیکن اُس کے ہاں کی مستورات نے اُسے سمجھایا۔ کہ اگر تُم پورے طور سے برات لے کر نہ جاؤ گے۔ تو بہت نام دھرائی ہوگی۔ تمہارے خیالات بدل گئے ہیں۔ لیکن اُن لوگوں کے خیالات تو نہیں بدلے ہیں۔ حامد علی نے کل مناسب انتظام اپنی بڑی بہن اور بہنوئی کی رائے پر چھوڑ دیا۔ اور کہ دیا۔ کہ جو کچھ مناسب ہو سو کرو۔ حامد علی اپنی بہن کا ایک اکلوتا بھائی تھا۔ اُس کے دل میں کیا کیا چاؤ نہ تھے۔ اُس نے اس بیاہ میں خُوب دل کھول کھول کر سامان کئے۔ حامد علی کا کوٹ پتلون بڑھوا دیا۔ اُس کی جگہ ہندوستانی جگمگاتا خلعت پہنایا۔ سر پر موتیوں کا طُرّہ اور سہرا باندھا۔ گلے میں موتیوں کی کنٹھی پھُولوں کی بدھیاں۔ ہاتھوں میں پھُولوں کے گجرے پہنائے ۔ مُرصّع کنگنا باندھا۔ اُنگلی میں ہیرے کے نگوں کی انگوٹھی پہنائی ۔ کمر سے مُرصّع پٹکا باندھا۔ دُولھا کو ایسا بنایا سنوارا۔ کہ سات شہزادوں کا حُسن اُس پر قربان ہوتا تھا ۔

غرض ہو کے اس طرح آراستہ خراماں ہُوا سرو نو خاستہ

بجاتے ہُوئے شادیانے تمام چلے آگے آگے ملے شادکام

تماشائیوں کا جُدا تھا ہجوم کہ ہر سمت تھی لاکھ عالم کی دھوم

غرض اِس طرح سے سواری چلی کہے تو کہ بادِ بہاری چلی میرحسن

صُبح کا سہانا وقت تھا۔ چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ نیک بندے یادِ الٰہی میں مصروف تھے۔ کہ حامد علی برات لئے شہر میں وارد ہُوئے۔ گولے چلنے لگے۔ نفیری اور انگریزی باجے کی سُریلی آوازوں سے شہر گُونج اُٹھا + آناً فاناً میں برات لڑکی والوں کے دروازے پر پہنچ گئی + تمام بری کا سامان لب سڑک لگا دیا گیا + باجوں میں صبح کی خوشی اور خدا کی حمد کے گیت گائے جانے لگے + ابھی یہ سب سامان ٹھیک ہو بھی نہیں چکا تھا۔ اور دُولھا گھوڑے ہی پر سوار کھڑا تھا۔ کہ صفیہ کا باپ اندر سے ڈھاڑیں مارتا نکلا۔ حامد علی اُسے دیکھتے ہی سہرا وغیرہ پھینک گھوڑے پر سے نیچے اُتر کھڑا ہُوا۔ اصغر حسین حامد علی سے چمٹ گیا۔ اور رو رو کر کہنے لگا۔ کہ ہائے تم ڈولا لینے آئے۔ میری صفیہ کا تو گہوارہ تیار ہو رہا ہے + یہ فقرہ سُنتے ہی حامد علی غش کھا کر گر پڑے + اندر باہر کُہرام مچ گیا + جلدی جلدی حکیم بُلائے گئے۔ حال احوال پُوچھا۔ معلوم ہُوا۔ کہ جان ہار صفیہ نے صبح ہونے سے پہلے ہی دم دے دیا۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلَیْہِ راجعون +

وہ گھر جس میں شادی کی دُھوم دھام مچی تھی۔ ماتم خانہ بن گیا + اپنا بیگانہ صفیہ کے غم میں چاک گریباں کئے نوحہ کر رہا تھا۔ کوئی کہتی تھی۔ کہ غم کی

برداشت نہ کرسکی۔ دل پھٹ گیا۔ کوئی کہتی تھی۔ اے گھر میں بیسیوں زہریلی دوائیں رکھی تھیں۔ غصّے میں آن کر زہریلی دوا پی لی ہوگی + کوئی کہتی تھی۔ اسی واسطے لڑکیوں کا پڑھانا لکھانا بُرا ہوتا ہے + غرض جتنے مُنہ اُتنی باتیں + مخلوق کا اس قدر ہجوم تھا۔ کہ تمام شہر اُمڈ پڑا تھا + دیوان خانے میں اس قدر خلقت جمع تھی۔ کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی + گھر میں اس قدر بیبیاں تھیں۔ کہ تھالی پھینکو تو سر پر ٹکے +

باراتیوں نے زرق برق جوڑے اُتار ماتمی لباس پہن لئے۔ گھر بھر میں کُہرام مچ رہا تھا + بدنصیب صفیہ کی ماں کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی + صفیہ کو گلے سے لپٹائے بُت بنی ہوئی تھی۔ کسی کو یہ کہتے سُنتی۔ کہ صفیہ مرگئی ہے۔ تو چلاّتی۔ کہ اے بیبو کیوں بدشگونی کا لفظ مُنہ سے نکالتی ہو۔ میری صفیہ کی تو آج برات ہے + امّاں قُربان سُنتی نہیں ہو۔ لوگ کیا کہتے ہیں؟ امّاں کی پیاری امّاں کو کس پر چھوڑ گئیں میری لاڈو تیرا نوڈولا تیار ہے۔ میں تو تجھے کہیں نہ جانے دُونگی۔ ہائے میری بستی تو کس گھر کو بسانے چلی؟ میری جان سُسرال جاتیں تو آس رکھتی کہ اب میری بچّی جاویگی۔ ہائے تم تو وہاں چلیں جہاں سے کبھی نہ آؤگی۔ کبھی یہ نوحہ پڑھتی تھی اور بلبلاتی تھی ؎

مرگئیں بیٹی جواں۔ ہائے یہ کیا ہوگیا ہوگئی برباد ماں۔ ہائے

بیاہ کا تیرے چاؤ تھا تھی بہت میں شاد شاد آہ میری نامُراد۔

اے میری غنچہ دہن۔ ہائے میری کم سخن اے مری گلگوں

تیری نسبت کے چھڑا دینے کی یہ پائی سزا ...

خاک میں مل جائے ماں۔ مجھ سی نہیں ناشاد ماں
مرگئیں کرٹیل جواں۔ ہائے یہ کیا ہو گیا

غرض صفیہؔ کی ماں کی بے قراری اور دل فگاری کی یہ باتیں ایسی تھیں۔ کہ کیسا ہی سنگ دل سے سنگ دل سُنتا تھا تو اپنا سر دُھننے لگتا تھا ؛

جب صفیہؔ کو اُس کے بستر پر سے اُٹھایا گیا۔ تو اُس کے سرہانے سے ایک بند لفافہ ملا۔ اُسے کھولا تو معلوم ہُوا کہ اُس نے اپنے مرنے سے پہلے یہ تحریر بطور وصیّت کے لکھی۔ جو یہاں بجنسہٖ درج کی جاتی ہے:۔

صفیہ مرحومہ کی آخری وصیّت

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں　　خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

میرے بزرگو میری یہ تحریر آپ اُس وقت پڑھیں گے۔ جب مَیں نہ ہونگی میری یہ تحریر اپنے فائدے کے واسطے نہیں ہے۔ مَیں نے تو افسوسناک ت کا جس طرح بن پڑا خاتمہ کر لیا۔ مجھے خیال ہے تو اپنی دُوسری ۔ جو اس قسم کی مصیبتوں میں تڑپ رہی ہیں۔ اُنہیں کے سے یہ عریضہ لکھنے لگی ہوں۔ اپنا مطلب بیان کرنے سے پہلے میری ان چند سطور میں کچھ اثر دے ؛

نی ابتدائی پُر لُطف زندگی کے تمام واقعات

اور اُن کا یہ دردناک اور حسرت انگیز خاتمہ ایک کاپی میں قلمبند کر رکھا ہے
وہ کاپی میری کتابوں کی الماری میں بائیں ہاتھ کی طرف تہذیب نسواں
کی پہلی جلد کے ساتھ رکھی ہے۔ جن عزیزوں کو مجھ سے محبت ہے۔ اور
جن پیاروں کو کچھ اس بات کا خیال ہے۔ کہ بدنصیب صفیہ کی آرزو کو پورا
کیا جائے۔ اُن سے اس مسافر کی یہ آخری وصیت ہے۔ کہ میری اس کاپی
کو چھاپ کر مشتہر کیا جائے + بدنامی کا خیال ہو۔ تو اختیار ہے۔ قصے کے
ناموں کو بدل دینا + غرض مطلب یہ ہے۔ کہ میرا عبرت ناک قصہ گھر گھر پڑھا
جائے + تاکہ اس کے ذریعے چھٹ پن کی منگنی اور زبردستی کا نتیجہ ہر ایک
کو معلوم ہو جائے کہ ایسا ہوتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی بدتر + میری زندگی
کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا ہے۔ میرے عزیزوں نے جو تجویز میرے لئے
کی اُس کی ناگہانی چوٹ نے مجھ میں کچھ تاب و تواں نہیں چھوڑی۔ مجھے
یہ خطرہ ہے۔ کہ شاید اس تحریر کے لکھتے لکھتے میرا خاتمہ ہو جائے گا۔ میرا دل
دم بدم گھٹتا جاتا ہے۔ اور سانس رُکتا ہے + اگر میں اس تحریر کو کسی طرح
پورا کر لوں۔ تو میں بڑی خوش نصیب ہوں + یہ میرے دل کی کمزوری ہے
اور اپنی بُری بھلی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ کہ میں اس وقت اپنی جان سے ہاتھ دھوئے
بیٹھی ہوں + کاش میں سخت دل محض جاہل اَن پڑھ لڑکی ہوتی۔ میں نے
علم حاصل نہ کیا ہوتا۔ خدا و رسول کے احکام نہ پڑھے ہوتے۔ کیونکہ اگر
مجھے علم نہ ہوتا تو مجھے یہ خوف بھی پیدا نہ ہوتا۔ کہ ناموافق شوہر کے
حقوق خدمت ادا نہ ہونے سے میں گنہگار ہونگی۔

کا بعد میں جو انجام ہوگا۔ اُسے مَیں کس طرح کاٹوں گی + اگر مَیں جاہل مطلق ہوتی تو مجھے اُونچ نیچ کا کچھ خیال نہ ہوتا۔ اور اس واقعہ کے پیش آنے سے ذرا ملال نہ ہوتا۔ یا اگر ہوتا تو صرف اس قدر کہ میری آرزُوئیں مر جاتیں۔ نہ کہ مَیں خود ہی مر جاتی + مَیں خوش ہُوں۔ کہ مَیں اس دُنیا سے جانے والی ہوں + اگر مَیں زندہ رہتی تو مَیں اپنی کمزوری کی وجہ سے پیش آنے والی مصیبتوں کی شاید ہی متحمل ہو سکتی۔ خدا جانے مَیں اپنی کس مشکل اور مصیبت میں کیا کرتی؟ شاید تنگ آ کر کبھی خلاف شان والدین کوئی کلمہ میرے مُنہ سے نکل جاتا۔ یا شاید توبہ توبہ میری زبان کوئی شکایت اُس قادر ذوالجلال کی کر بیٹھتی۔ غرض نہیں معلوم کہ کیا کیا دقتیں پیش آتیں۔ اور مَیں اُن کا مقابلہ کس طرح کرتی؟ شکر الحمدللہ کہ مَیں دُنیا سے پاک وصاف جاتی ہوں ؎

خوب سی سَیر کی اور خُرم و دل شاد رہے باغباں جاتے ہیں گلشن ترا آباد رہے

اے میرے بزرگو! مجھے اپنی ہی جیسی اَور بے زبان بہنوں کا دھیان ہے اور عجب نہیں کہ یہ بے چینی مجھے قبر میں بھی چَین نہ لینے دے + للہ اپنے جگر گوشوں پر رحم کرو + اگر مائیں جاہل ہیں۔ اور جہالت کے باعث نیک و بد نہیں سوچتیں۔ تو آپ تو عاقل اور دانا ہیں۔ ایسے بھاری اور ضروری معاملے کو جاہل عورتوں کے ہاتھ میں ڈال کر اولاد کو کیوں برباد کرتے ہو؟ میرے بزرگو! جب اپنی کمزور اولاد (لڑکیوں) کے قرض سے سبکدوش ہونا چاہو تو اچھی طرح دیکھ لو کہ جس گاڑی میں تم اُسے جوتنے والے ہو وہ گاڑی بوجھل ہے یا ہلکی۔ بیاہ شادی پاؤں کی جُوتیاں نہیں ہیں جو پہنا دی

گئیں۔ اور برس چھ مہینے میں پُرانی ہوگئیں تو اَور بدل لیں۔ یہ معاملے سروں کے ساتھ جاتے ہیں ❊

اے بزرگو مت بیاہو اپنی بیٹیوں کو بد چلن لڑکوں سے ورنہ تمہاری وہ بیٹی جس کی آنکھ میں ذرا سے مرض کے آنسو دیکھ کر تم گھبرا جاتے ہو۔ اور دوائیں اور سُرمے لگاتے پھرتے ہو تمام تمام رات اور تمام تمام دن رنج و غم میں گھُلے گی اور لہو کے آنسو روئے گی ❊

مت بیاہو اپنی پڑھی لکھی دست و قلم بیٹی کو جاہل لڑکے سے ورنہ اس کا وہ علم جو تم نے بڑی بڑی کوششوں سے اُسے سکھایا ہے۔ جسے وہ جامۂ انسانیت جانتی ہے ذلیل ہو جائے گا۔ اور اُس کی خرابی اور بربادی کا موجب بنے گا ❊

مت بیاہو اپنی بیٹی کو کسی ایسے شخص کے ساتھ جس کو وہ دل سے ناپسند کرتی ہو۔ ورنہ اُس کی تمام عمر رنج و غم میں کٹے گی۔ وہ خود روتی اور اَوروں کو رُلاتی رہے گی ❊

اب میرے ہوش و حواس بجا نہیں۔ میں یہ بھی نہیں جانتی کہ میں جو کچھ لکھ رہی ہوں وہ بجا ہے یا بے جا۔ میری غرض یہ ہے۔ کہ بیٹیوں کے بیاہ کو گُڑیا کا بیاہ نہ بنایا جائے۔ اس میں جہاں تک ہو سکے کوشش اور چھان بین کرنی چاہئے کیا تمہارا یہ جی بیاہنا ہے۔ کہ جس جگر کے ٹکڑے کو سولہ سترہ برس تک تعویذ کی طرح گلے سے لگائے رکھا جس جگر کے ٹکڑے کی ایک دن کی بیماری تمہیں ناگوار گزرتی ہے اُس کا [illegible]

عمر زخمی رہے۔ اور وہ طرح طرح کے رنج و مصیبتیں جھیل جھیل کر اس دُنیا سے اُٹھ جائے۔

اے بزرگو! میری آخری التجا یہی ہے۔ کہ تم اپنی اولاد کے بیاہ شادی میں جان توڑ کر چھان بین کرو۔ یہ چھان بین جس طرح ذات اور نسب کی کی جاتی ہے اسی طرح علم کی صحت جسمانی کی۔ عادات کی۔ چال چلن کی۔ مزاج کی کیفیت کی۔ اخلاق کی اور سب سے زیادہ لڑکی کی رضامندی کی کی جائے۔ اگر تمہیں کوئی اچھا بر نہ ملے تو بھلے ہی بیٹی کو گھٹنے سے لگائے بٹھائے رکھو۔ یہ ساری عمر کا بیٹھنا آسان ہے۔ لیکن شمع کی طرح ہمیشہ کا جلنا اور گھلنا وبالِ جان ہے۔

میرا دل اس وقت برقرار نہیں اور ذہن صاف نہیں۔ کہ میں اپنا مطلب صفائی سے لکھ سکوں۔ میرا وقت شاید آن پہنچا۔ میری طبیعت میں گھبراہٹ اُٹھنے لگی ہے۔ دل زیادہ زور سے دھڑک رہا ہے۔ رخصت کی گھڑی سر پر کھڑی معلوم ہوتی ہے۔ ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے ہیں۔ شاید دو چار سانس اور باقی ہوں ؎

واقف ہوئے نہ اہلِ جہاں کے طریق سے ۔۔۔ بیگانہ وار آئے تھے ناآشنا چلے

آباد رکھے حق تجھے اے شاد کام عیش ۔۔۔ خادم ترے۔ غریب ترے۔ بے نوا چلے

ہر وقت جاؤ جاؤ کہاں تک سُنے کوئی ۔۔۔ در سے ترے چلے چلے او بے وفا چلے

جاتے ہیں اب وہاں کہ جہاں سے نہ آئینگے

گر دردِ و غم کو ساتھ ہو چلنا۔ چلا ۔ چلے

اے کمزور ناتوان دل! مضبوط ہو۔ اے جان! تُو جسم خاکی میں ہے۔ بہت رہ چکی۔ اب نکلنے کی تیاری کر۔ سنسان رات ہے۔ تمام دُنیا اہلِ دُنیا سوتے ہیں۔ کوئی میری اس وقت کی بے قراری نہیں دیکھ سکتا۔ اے سیاہ رات! تُو میری سیاہ بختی پر بھی پردہ ڈال دے۔ اے آسمان کے تارو! خدا کے واسطے تم بھی اپنی آنکھیں بند کر لو۔ اے پاک فرشتو تم بھی میرے کندھوں سے سرک جاؤ۔ اور ملک الموت کو آنے دو۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ (یہ کہہ کر اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی) ❊

انہیں مُصنّفہ کی اَور کتابیں

سُگھڑ بیٹی۔ کنواری بچیوں کے لئے سگھڑاپے کی سب سے اچھی رہنما ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۲ر

رفیق عروس۔ نئی دُلھن کے لئے شوہر کے خوش رکھنے کی ضروری ہدائتیں ۔ ۔ ۹ر

آداب ملاقات۔ زنانہ میل ملاپ کے ضروری آداب اور مہمانداری کے مہذب قاعدے ۶ر

نعمت خانہ۔ ہندوستانی کھانوں کی نہایت مفصل۔ آسان اور باکفایت ترکیبیں ۔ ۔ ۔ عمر

سچّے موتی۔ سلیس اور دلچسپ نظمیں لڑکیوں کے لئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴ر

ناج گیت۔ ننھے بچوں کے لئے بہت آسان گیت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲ر

ناج پھول۔ چھوٹے بچوں کی ادب اور نصیحت کی آسان کتاب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲ر

شریف بیٹی۔ شریف لڑکی کا قصّہ جس نے اپنی بیمار ماں کی مدد کی ۔ ۔ ۔ ۳ر

امتیاز بچیسی۔ ۲۵ تصویردار کہانیاں جنہیں ۳ سال کا بچّہ سمجھ سکے ۔ ۔ ۔ ۴ر

دل پسند کہانیاں۔ بچّوں کو سُنانے کی کہانیاں دہلی کی سندی زبان میں تصویردار ۸ر

دلچسپ کہانیاں۔ بچوں [illegible] آسان زبان میں اچھی کہانیاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۶ر

خواب راحت۔ دہلی کی مشہور لوریاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲ر

حیات اشرف۔ اشرف النساء بیگم صاحبہ کی سوانح عمری ۔ ۔ ۔ ۔ ۶ر

طبیب نسواں۔ بیاہی عورتوں کے پڑھنے کی۔ زچہ اور بچہ کے امراض کا علاج ۸ر

انگریزی گریمر۔ انگریزی سیکھنے کے واسطے نہایت آسان گریمر بچوں کے لئے ۱۰ر

مینجر تہذیب نسواں لاہور سے طلب کرو